

اور لائن کٹ گئی!

کوثر نیازی



...اور لائن کٹ گئی!

کوثر نیازی

احمد پبلی کیشنز، لاہور

Scanned by iqbalmt@urdu-forum.com

پہلا ایڈیشن: فروری 1987ء
 احمد علی کیشنز سے بار دوم: اپریل 2007ء
 نائٹل ڈیزائن: سید سلمان حسن
 پرنٹر: حاجی حنیف پرنٹرز
 قیمت: =/250 روپے

احمد علی کیشنز کی کتب دستیاب ہیں

مشاق بک کارنز، اردو بازار لاہور۔ فون: 7230350

علم و عرفان، اردو بازار لاہور۔ فون: 7352332

نگارشات، مزنگ روڈ لاہور۔ فون: 7322892

ویلکم بک پورٹ، اردو بازار کراچی۔ فون: 2633151

اشرف بک انجینسری، کمیٹی چوک راولپنڈی۔ فون: 5531610

AHMAD PUBLICATIONS

35-Royal Park, Lahore-Pakistan

Ph: (042) 6363009, 6363452

E-mail: ghalibooks@yahoo.com



Scanned by iqbalmt@urdu-forum.com

ترتیب

صفحہ نمبر

7	وہ خونخوار رات	پہلا باب
12	انتخابات، وقت سے پہلے کیوں؟	دوسرا باب
21	بیوکرسی کے نرغے میں	تیسرا باب
37	نجومیوں اور دست شناسوں سے مشورے	چوتھا باب
41	انتخابی مہم کا آغاز	پانچواں باب
48	جرنیلوں سے مشورے	چھٹا باب
52	جزوی مارشل لاء کا نفاذ	ساتواں باب
57	غیر ملکی ہاتھ؟	آٹھواں باب
63	ری پراسنگ پلانٹ کے پس پردہ حقائق	نواں باب
75	مارشل لاء کے حق میں بیجی، مختیار کے دلائل	دسواں باب
78	نذاکرات کی طرف پیش رفت، PNA کا مصالحتی فارمولا	گیارہواں باب
95	بھٹو صاحب سہالہ ریست ہاؤس میں	بارہواں باب
105	نذاکرات کی راہ ہموار ہوتی ہے۔	تیرہواں باب
110	جرنیل ایکسپوز ہوتے ہیں	چودھواں باب

پہلا باب

وہ خوفناک رات

”اباجی ... اباجان“

میرا بیٹا روف مجھے بیمار سے سب گھروالے روئی کہتے ہیں 'میرے کندھے پر ہاتھ رکھے مجھے ہلارہا تھا' ابھی اس نے دوسری مرتبہ ہی پکارا تھا کہ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چہرے پر کچھ پریشان سی لکیریں تھیں۔ آنکھ کھلتے ہی پہلی نظر انہی پر پڑی اور پل بھر میں میرے ذہن اور جسم سے نیند اڑ گئی اور مسلسل بیمار نہ جانے کتنے ہی لمحوں کی تھکن دور ہو گئی۔

یہ ۳ اور ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی درمیانی رات تھی میں سات۔ ماٹھے سات بجے رات کا بیڈ کے اجلاس سے فارغ ہو کر پرائیم منسٹر ہاؤس سے گھر واپس پہنچا تھا۔ ملک کے سیاسی حالات اس قدر ابتر ہو چکے تھے کہ اب یاد نہیں آتا اگر ان دنوں ذہن کو ایک لمحہ بھی فراغت کا نصیب ہوا ہو، گزرتا ہوا جہل اور ہر لمحہ چاروں طرف پھیلی ہوئی ابتری میں اضافہ ہی کرنا تھا۔ ہنگامے، پڑتالیں، جلوس، جلے..... لاقانونیت اور تشدد کی جو لہرائٹھ کھڑی ہوئی تھی اسے روکنے کی ہر کوشش ناکامی سے ہم کنار ہو رہی تھی۔ یوں سوس ہو تا تھا جیسے جو کچھ ہو رہا ہے کسی فطری قانون کے تحت ہو رہا ہے اب اسے روکنا ہم میں سے کسی کے بس میں نہ رہا ہو۔

اس وقت کا بیڈ کی اہم میٹنگ تقریباً سات ساڑھے سات بجے ختم ہوئی اس میں اہم قومی نوعیت کے بہت سے مسائل زیر بحث آئے تھے۔ چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد ضیاء الحق نے بھی اس میں شرکت کی تھی اور اجلاس ختم ہونے کے بعد وہ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ ہی ان کے کمرے میں تشریف لے گئے تھے ہم کا بیڈ کے کچھ اراکین کمرہ اجلاس سے باہر کھڑے آپس میں گپ شپ کرنے لگے، اچانک جنرل صاحب مسٹر بھٹو کے کمرے سے بڑی تیزی میں باہر آئے آج وہ معمول سے زیادہ جگت میں تھے۔ عام دنوں میں تو ان کے ہاتھ ملانے کا نواز ایسا ہوتا تھا جیسے ان کے ہاتھوں کی گرفت شاید ہی چھوڑنے پائے مگر آج میں نے ان سے ہاتھ ملا یا تو وہ بمشکل انگلیاں ہی ملا پائے ان کے چہرے سے ان کی مخصوص مسکراہٹ بھی غائب تھی۔ میرا ہاتھ اب جس نمکائی لگا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ ابھی میں اس پر غور ہی کر رہا تھا کہ میرا فضل خان نے آواز دی "چلتا نہیں" "اودھ ضرور..... چلے" اور پھر ہم دونوں ایکٹھے ایک ہی کار

116

پندرہ ہواں باب گذارات کے دوران پتھیز پارٹی مسودہ پیش کرنی ہے

130

سولہواں باب نہ جائے رفتن، نہ پائے ماندن

137

سترہواں باب ڈیڈ لاک ہوتا ہے

146

اٹھارواں باب فیصلہ کن موڑ، سنسنی خیز لمحات

153

انیسواں باب کچھ متفرق باتیں

162

بیسواں باب بھٹو موڈ دی ملاقات۔

166

اکیسواں باب اور۔۔۔۔۔ لائن کٹ گئی۔

172 تا 189

بائیسواں باب نایاب تصاویر
50 صفحات کے انگریزی ضمیمہ جات

میں پرائم مشن ہاؤس سے باہر نکلے۔ گاڑی کے شیٹوں سے باہر میں روشنیوں پر یوں نظر ڈال رہا تھا جیسے آج انہیں آخری مرتبہ دیکھ رہا ہوں جیسے کوئی میرے اندر سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا وقت ختم ہو چکا ہے۔ آج کے بعد یہ ماحول یہ عمدہ یہ دوز سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ اس پر الوداعی نظریں ڈال لو۔“

مجھے معلوم نہیں کہ بقیہ سزکس طرح گزرا۔ میرا فضل مجھے میری رہائش گاہ پر ڈراپ کر کے چلے گئے۔ وہ مجھ سے ذرا ہی آگے قیام پذیر تھے میں گھر میں داخل ہوا میرے تینوں بیٹے طارق، رؤف اور رضوان ابھی تک جاگ رہے تھے۔ بیوی اور بیٹی عمرہ کرنے سعودی عرب گئے ہوئے تھے۔ میں نے تینوں بچوں کو اپنے کمرے میں بلا یا اور پھر طارق کو چند خصوصی ہدایات دیں چونکہ اس کے حوالے کی اور اسے بتایا کہ بوقت ضرورت میری عدم موجودگی میں اسے گھر کس طرح چلانا ہو گا۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے تینوں بچوں نے میری باتوں کو اس طرح سمجھا جس طرح سمجھنا چاہئے تھا۔ انہوں نے نہ تو کسی غیر معمولی تردد کا مظاہرہ کیا نہ پریشانی کا۔ روز بروز بڑھتے ہوئے حالات کا اندازہ انہیں خود بھی تھا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ اگر میری عدم موجودگی میں انہیں موجودہ رہائش گاہ چھوڑنی پڑے تو وہ کوئی دوسرا مکان تلاش کر لیں، فوری طور پر دستیاب نہ ہو تو لاہور چلے جائیں۔

اسی دوران راولپنڈی سے راجہ عبدالعزیز بھٹی ایم این اے کا فون آیا میں نے ان سے بھی یہ کہا کہ وقت تیزی سے گزر رہا ہے، کسی لمحہ فوج قبضہ کر سکتی ہے۔ معلوم نہیں آج کی رات بھی خیریت سے گزرتی ہے کہ نہیں؟“ بچوں کو سونے کی تلقین کرنے کے بعد میں نے کراچی میں اپنے معالج اور دوست ڈاکٹر امجیری کو فون کیا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لانے والے تھے میں نے ان سے کہا ”آپ نے بہت دیر کر دی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کل آئیں اور ہم سے مل ہی نہ پائیں۔“

رات کو تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے قریب میں سونے کے لئے لیٹا۔ جب میری پلکیں نیند کے دباؤ سے خود بخود بند ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ اور..... اب..... جب روٹی کی آواز سے آنکھ کھلی تو رات کے تقریباً پونے تین بجے کا مل تھا۔

”کیا بات ہے بیٹے؟“ میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے دریافت کیا: ”خیریت تو ہے؟“

”باجان! کچھ آدمی بھتت پر چڑھ آئے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں بندوقمیں ہیں“

”بندوقمیں“..... میں نے اٹھ کر کمرے سے باہر آتے ہوئے کہا ”جی ہاں..... یہ آپ اپنا ہسپتال ساتھ لے لیں“ اس نے کتکے کے نیچے سے ہسپتال نکال کر میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ مجھے فوری طور پر کچھ اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ کون لوگ ہوں گے جو بندوقمیں لئے ہوئے بھتت پر چڑھ آئے ہیں۔ روٹی کا کمرہ باہر کے رخ پر تھا اس نے اچانک دیکھا کہ دو آدمی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے پانی کے پائپ کے ذریعے بالکنی پر چڑھے اور پھر ان کے فوراً بعد دو آدمی مزید اوپر آگئے، چاروں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ روٹی یہ دیکھتے ہی بھاگتا ہوا میرے کمرے میں پہنچا اور مجھے چگا کر یہ اطلاع دی اتنی دیر میں

میں ٹپنے کمرے سے باہر آچکا تھا۔ ہسپتال میرے ہاتھ میں تھا میں نے بیٹنی ہال کے دروازے پر پڑے ہوئے پردے سے سرکاتے تو باہر بالکنی میں لگے ہوئے لمبوں کی روشنی میں عین جالی سے متصل ودفنی کھڑے تھے ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں جو سیدھی میری جانب تکی ہوئی تھیں ایک لمحے کے اندر میرے ذہن میں بنگلہ دیش کے شیخ مجیب الرحمن کے خلاف آنے والے فوجی انقلاب کا پورا نقشہ گھوم گیا مجھے اپنے پورے بدن میں سنسنی اور تناؤ کی ایک ایسی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی جو صرف موت کو اپنے مقابل کھڑے دیکھ کر ہی محسوس ہو سکتی ہے میرے ذہن میں جھماکے سے ہورہے تھے پل بھر میں سینکڑوں مناظر میری آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے کیس شیخ مجیب کی لاش خاک و خون میں پڑی تڑپ رہی تھی اور ان کے اہل خانہ کے بے جان لاشے پڑے تھے۔ مجھے بالکل یہی محسوس ہوا جیسے اب سے چند لمحوں بعد ہی قیامت ایک مرتبہ پھر گزرنے والی ہو۔

میں نے دونوں فوجیوں سے کسی بھی تاثر سے خالی آواز میں پوچھا ”شوٹ کرنا ہے یا گرفتار کر دے گے؟“

”سر..... گرفتاری چاہئے“ ایک نے جواب دیا۔ میرے اندر کہیں دور سے جیسے اطمینان کی سانس کسی ان جانے سفر رنگی اور میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

میں نے فوجیوں سے پوچھا۔

”کپڑے تبدیل کر سکتا ہوں یا اسی طرح چلنا ہو گا۔“

”آپ کپڑے تبدیل کر لیجئے“ اسی فوجی نے جواب دیا۔ اسی اثنا میں ایک مجرا در مزید چار فوجی جوان میرے کمرے کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ روٹی حیران پریشان کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا میں نے اسے کماؤ طارق اور رضوان کو نہ جگانے اور خود بھی جا کر سو جائے۔

میں نے کپڑے تبدیل کئے اور یہ جاننے کے لئے کہ وزیر اعظم کس حال میں ہیں انہیں ٹیلی فون کرنا چاہا۔ سب سے پہلے میں نے گرین ٹیلی فون اٹھا یا لیکن وہ ڈیڈ تھا۔ باقی فون بھی اسی طرح ملے۔ کیٹین نے میری یہ کوشش دیکھ کر مجھے بتایا کہ ٹیلی فون کٹ چکے ہیں۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ مٹری کے جوان جب میری رہائش گاہ پہنچے تو انہوں نے سب پہلے اس کیسٹین پر ہی قبضہ کیا۔ آپریٹرز اس وقت اونگھ رہا تھا جب اس نے اچانک ہی خود کو مٹری کے جوانوں کے نرغے میں پایا تو وہ گھبرا گیا اس نے سمجھا شاید اس سے ڈیوٹی کی حالت میں اونگھنے کی جو کوتاہی سرزد ہوئی ہے مٹری کے جوان اس سے اس کی باز پرس کرنے والے ہیں اس نے بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کیا اور چند لمحوں میں سیدھی حرکتیں کر بیٹھا جس پر مٹری کے جوانوں نے دو چار تھپڑ سید کر کے اسے نیند سے نجات دلائی اور پھر فوراً ہی ٹیلی فون کی تاریں کاٹ ڈالیں۔

ان کے رویے میں اس ابتدائی جارحیت کے بارے میں مجھے بعد میں علم ہوا کہ اس کا سبب وہ

میں نے کپڑے تبدیل کر لیجئے“ اسی فوجی نے جواب دیا۔ اسی اثنا میں ایک مجرا در مزید چار فوجی جوان میرے کمرے کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ روٹی حیران پریشان کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا میں نے اسے کماؤ طارق اور رضوان کو نہ جگانے اور خود بھی جا کر سو جائے۔

پائے کا بے حد شوق ہے اور پورے سندھ میں جن کے پاس بہترین قسم کے بعض نمیت خونخوار کتے ہیں ان کے ہاں بھی ملٹری کے جوانوں کو خاصی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا تھا جس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ شاید میرے ہاں بھی انہیں کسی ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن جب میرے ہاں انہیں مکمل طور پر پرامن فضائی توان کی جھلکاہٹ ختم ہو گئی میں نے ان کے رویے میں دوستانہ تبدیلی محسوس کی میں نے پوچھا کیا میں قرآن مجید 'جائے نماز اور چند جوڑے کپڑوں کے ہمراہ لے سکتا ہوں؟ جواب ملا "کوئی چیز ہمراہ لینے کا حکم نہیں" "کیا آرمی انقلاب لے آئی ہے" میں نے مجھ سے پوچھا "سر..... نہیں اس قسم کے کسی سوال کا جواب دینے کا اختیار نہیں" "مجھ نے اپنے مخصوص فوجی انداز میں جواب دیا۔"

ابھی ہم اوپر سے نیچے اترنے کے لئے سڑکیاں طے کر رہے تھے کہ نیچے سے ایک آواز آئی "میرے لئے چپل ساتھ لیتے آنا" یہ عبدالحفیظ پرزادہ کی آواز تھی۔ میں نے مجھ کی طرف دیکھا وہ بولا "لے لےجئے" دوبارہ اپنے کمرے میں آکر میں نے چپل اٹھائے اور نیچے اترانے کا پورا سگن فوجی وردیوں میں ملبوس سپاہیوں سے ہمراہ ہوا تھا۔

میں نے چپل حفیظ پرزادہ کو دیئے جو شب خوابی کے لباس میں ننگے پاؤں ہی فوجی دستے کے ہمراہ چلے آئے تھے ہم دونوں کو الگ الگ جیبوں میں بٹھا دیا گیا۔ گاڑی صدر دروازے کے باہر نکلے تو میں نے دیکھا یہاں فوجی وردیوں میں ملبوس بے شمار سپاہی ایستادہ تھے جو کئی ٹرکوں اور گاڑیوں میں اس " آپریشن " کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ اس وقت رات کے تقریباً سات بجے ہوں گے جب یہ قافلہ زبرد پوائنٹ کے قریب پہنچا اور رک گیا ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا جو کہ میں چند فوجی جیبیں کھڑی تھیں۔ میں نے اپنے ہم سفر فوجی افسر سے دریافت کیا "ہم یہاں کیوں رکے ہیں؟" اس نے بتایا کہ "ممتاز بھٹو صاحب بھی آئے والے ہیں وہ آجائیں تو قافلہ ایک ساتھ آگے روانہ ہو گا" اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔

تھوڑی دیر بعد ہی رات کا سناٹا ایک مرتبہ پھر فوجی گاڑیوں کے شور سے گونج اٹھا معلوم ہوا ممتاز بھٹو صاحب آہنچے ہیں لن کے آتے ہی ہمارا ٹھہرا ہوا کٹوائے بھی حرکت میں آ گیا اور گرد و حد نظر تک تاریکیوں کا راج تھا۔ کہیں کہیں سڑیٹ لائٹیں روشن تھیں۔ شہر سے گزرتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ بعض اہم ناگوں پر فوج کی تعیناتی عمل میں آچکی تھی۔

اب ہم جس راستے سے گزر رہے تھے اسے بچانے میں مجھے ذرا بھی دیر نہ لگی یہ راستہ چک لالہ کو جاتا تھا جہاں وزیر اطلاعات و نشریات ہونے کی حیثیت میں کبھی میرا دفتر ہوا کرتا تھا بالآخر تمام فوجی گاڑیاں خار دار تاروں سے گھرے ہوئے ایک دفتر کے احاطے میں جا کر رک گئیں، میں ایک کمرے میں پہنچا یا گیا جہاں پہلے ہی سے اچھی خاصی محفل جمی ہوئی تھی۔ صوفوں پر ریناز ڈجنرل نکا خان مفتی محمود اور پروفیسر غفور وغیرہ براجمان تھے اور چائے کا دور چل رہا تھا یہ تو صاف ظاہر تھا کہ فوج انقلاب لے آئی ہے لیکن اس انقلاب کا رہبر کون ہے اس کے بارے میں کسی کو کچھ پتا نہ تھا، نہ ہی کسی کو خبر تھی کہ سب بھٹو کہاں ہیں؟

ہم آپس میں بیٹھے ایک دوسرے کو اپنی اسیری کا حال سنا رہے تھے۔ ممتاز بھٹو کہنے لگے "جب گاڑیاں زبرد پوائنٹ کے قریب رکیں تو میں نے تو دل ہی دل میں کلمہ شہادت پڑھا لیا تھا میرا خیال تھا کہ اب اس دیرانے میں ہمیں شوٹ کر کے لاشیں اڑھری کیس کھیتوں میں زبامی جائیں گی پھر جب گاڑیاں چل پڑیں اور ویران علاقے سے گزریں تو میں نے خیال کیا شاید شہری آبادی سے باہر نکال کر ہمیں فائرنگ اسکوڈ کے حوالے کیا جائے گا کیونکہ رات کے سناٹے میں فائرنگ کی آواز زیادہ گونجتی جس سے شہریوں کے آرام میں خلل پڑ سکتا تھا ان کے پر مزاج انداز پر محفل میں بے اختیار تھکے گونج اٹھے۔

کچھ دیر کے بعد ہمیں اسی آفس سے ملحقہ پیرکس میں ایک ایک کمرہ دے دیا گیا سامنے کی ہیرکس میں بی۔ این ایس کے رہنماؤں کو بٹھرایا گیا ان میں پیر صاحب پگارا، امیر خان، نواب زادہ نصر اللہ خان، مولانا نورانی، مولانا مفتی محمود اور پروفیسر غفور شامل تھے اور مقابل کی ہیرکس میں ہم لوگوں کو..... ("ہم لوگوں" میں میرے علاوہ ممتاز بھٹو، حفیظ پیر زادہ، نکا خان، ڈاکٹر غلام حسین اور غلام مصطفیٰ کھر شامل تھے) اب قریب قریب نماز فجر کا وقت ہو چلا تھا میں نے اپنے کمرے میں آکر وضو کیا اور اپنا سر نیا زو عبودیت اپنے مالک کے سامنے جھکا دیا ایس میں یہ تشکر بھی شامل تھا کہ یہاں فوجی انقلاب تو آیا لیکن دوسرے ملکوں کی طرح یہ خونی نہ تھا، پرامن تھا یہ بعد میں معلوم ہوا کہ ہم لوگوں کو گرفتار کرنے والے دستوں کو خصوصی ہدایات تھیں کہ گرفتار شدگان کا مکمل ادب و احترام ملحوظ رکھا جائے ہاں اگر تم پر گولی چلے تو تم جو ابلی فائر کر سکتے ہو ورنہ خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرنے پائے اور نہ آپریشن ایسے انداز میں انجام کو پہنچے کہ کوئی ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو۔

نماز کے بعد میں بہتر ریٹ کیا کچھ دیر گزرے ہوئے واقعات ایک فلم کی مانند دکاہوں کے سامنے گھومتے رہے پھر نہ جانے کب خیزد کے بوجھ سے میری پٹلیں خود بخود بند ہو گئیں میں اٹھا تو سورج اچھا خاصا نکل آیا تھا اور کمرے کی میز پر ناشتی کے ٹرے میرا انتظار کر رہی تھی۔

یہ تھا جرنیلوں کی اس طویل رات کا انداز جو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو شروع ہو کر یکم جنوری ۱۹۸۶ء تک پھیل ہوئی تھی، گونج صادق اب بھی نہیں ہوئی ارباب شعور کی زبان پر اب بھی رہ رہ کر یہی بات آ رہی ہے کہ

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

تاہم ۱۳ جولائی کی درمیانی رات کو جو کچھ ہوا وہ مارشل لاء کا نظرد آغاز ہرگز نہ تھا، نخست اول میں کبھی تو بہت عرصہ پہلے آچکی تھی، بقول شاعر ہے

وقت کرتا ہے پرورش برسوں

خاندان ایک دم نہیں ہوتا



دوسرا باب

انتخابات، وقت سے پہلے کیوں؟

یہ ۱۵ ستمبر ۱۹۷۳ء کی شگرت رات تھی وزیراعظم بھٹو نے فرانٹس منجھی نمٹانے کے بعد عبدالحفیظ بھٹو زاہد رفیع رضا اور مجھے ڈنر کے لئے اپنی قیام گاہ پر روکایا تھا۔ حسب معمول تھوڑا سا ہنسا ہوا قیام پلٹ میں رکھے بیٹھے تھے بے تاثر چہرے کے ساتھ ہم تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے بولے۔

”یومِ فکر جس انداز میں منایا گیا اس کا حکومت کو کیا فائدہ ہوا؟“

وہ احمدیوں سے متعلق آئینی ترمیم کا حوالہ دے رہے تھے جس کی خوشی میں پاکستان بھر میں یومِ فکر منایا گیا تھا بھٹو صاحب کا خیال تھا کہ آئین میں اس ترمیم کا جو کریڈٹ حکومت کو ملنا چاہیے تھا وہ نہیں ملا ان کو شکایت تھی کہ..... ”مولوی اوٹ زبردستی اس کا سراپا اپنے سر باندھ رہے ہیں جس کے لئے ہمیں لوگوں کو اصل صورت حال بتانا چاہیے۔“

”لوگ اصل صورت حال جانتے ہیں جناب“ حفیظ نے اپنی روایتی اکثریوں کا مظاہرہ کیا۔
”مولویوں کے کہنے آدھی اسمبلیوں میں ہیں؟ عوام انہیں خوب جانتے ہیں، وہ ان کے کھوکھلے دعوں کے قریب میں نہیں آئیں گے۔ میرے خیال میں تو حکومت کو پورا کریڈٹ ملا ہے۔“

”آپ کا کیا خیال ہے مولانا“ وزیراعظم بھٹو نے نیم وا آنکھوں اور دبی دبی مسٹر اہٹ کے ساتھ مجھ سے سوال کیا۔ یہ ان کا ایک مخصوص انداز تھا۔ کبھی کبھی جب خوشگوار موڈ میں ہوتے تو تفسیقِ طبع کی خاطر اپنے قریبی رفقاء سے گفتگو کرتے ہوئے وہ یہی انداز اختیار کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر وہ مختلف انجیال لوگوں کو اظہارِ رائے کا موقع دیتے۔ وقتاً فوقتاً خود بھی ”کٹڑے“ دیتے رہتے جس کا مقصد گفتگو میں چمک پیدا کرنا ہوتا تھا جو عموماً آجاتی تھی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ گفتگو کے بجائے خود ”گفتگو کرنے والا“ چمک اٹھتا تھا۔ وزیراعظم ایسے مواقع پر ہمارے دوست خورشید حسن میر کی حرکات و سکنات اور باتوں سے بہت محظوظ ہوتے تھے۔ کچھ افراد اچھے خاصے ذہین و فطین ہوتے ہیں لیکن ان کی حس مزاح کند ہوتی ہے وہ ازراہ تفسیق کی گئی بات پر بھی فلسفیانہ موشگافیوں بگھانے لگتے ہیں اور سنجیدگی کی شدت سے چہرے پر تشبیح کی سی کیفیت طاری کر لیتے ہیں ایسے لوگ بھٹو صاحب کی تفریحِ طبع کا بہترین ذریعہ ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھے بتایا: ”میں نے کئی بار جے۔ اے۔ رحیم کو بے محل اور بے معنی

موضوع دے کر اس کی طویل تقریریں بڑی سنجیدگی سے سنی ہیں۔“

جب انہوں نے مجھ سے میرا خیال پوچھا تو ان کے ذہن میں درحقیقت صرف کریڈٹ کی بات نہ تھی معاملہ حقیقتاً کچھ اور تھا۔ ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا کر میں نے عموماً انداز میں بولنا شروع کیا۔
”یہ درست ہے کہ علماؤں کا سراپا اپنے سر باندھ رہے ہیں کیونکہ وہ ایک مدت سے یہ مہم چلا رہے تھے۔ ان کی طرف سے قربانیاں بھی دی گئیں لیکن فیصلہ تو ہر حال آپ کی حکومت نے کیا ہے۔ اب جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں آپ انتخابات کے نقطہ نظر سے سوچ رہے ہیں“ میں نے ایک لمحہ تامل کیا اور ان کے چہرے کے تاثرات دیکھے انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر پھر زاہد کی طرف دیکھا اور مجھے بولنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا۔

”اس اقدام سے مذہبی حلقوں میں آپ کی مقبولیت یقیناً بڑھی ہے لیکن انتخابات کے نتائج ان حلقوں میں مرتب نہیں ہوتے۔ سیاسی فیصلہ ہمیشہ سواوا اعظم کا ہوتا ہے اور سیاسی میدان میں اس وقت آپ کا گراف ۱۹۷۳ء سے نیچے ہے“ اس موقع پر میں نے ایک پرانی گفتگو کا حوالہ بھی دیا۔

لاہور کی اسلامی سربراہ کانفرنس کے دوران ایک رات ہم تھکے بارے سے بیٹھے کافی لمبی رہے تھے کہ مسز بھٹو نے اچانک سوال کیا۔ ”مولانا! آپ کا کیا خیال ہے، معزز مہمانوں کو الوداع کہنے کے بعد میں پھلا کام کون سا کروں گا؟“

”مجھے آپ کی رمز شناسی کا دعویٰ تو نہیں تاہم میرا خیال ہے کہ فنڈز کے مسائل حل ہو چکے ہیں اور اب آپ اپنے ایک دیرینہ خواب کی تکمیل پر توجہ دے سکیں گے“ میں نے جواب دیا تھا۔
”ہاں! مگر بعد میں“ بھٹو صاحب نے کہا تھا ”پھلا کام تو میں یہ کروں گا کہ اسمبلیاں توڑ دوں اور ساٹھ دن کے اندر اندر انتخابات کروا دوں۔“

”یہ بہترین موقع ہے“ میں نے جلاتامل تائید کی تھی اور میں آج تک اس رائے پر قائم ہوں کہ میں نے اس وقت انتہائی درست مشورہ دیا تھا اور وزیراعظم بھٹو کا فیصلہ دانش مندانہ تھا۔

مشرقِ پاکستان کی علیحدگی کے بعد باقی ماندہ پاکستان میں اکثریتی پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے مسز بھٹو نے حکومت تو بنائی تھی اور وہ اپنے اس اقدام کے حق میں دلائل بھی دیا کرتے تھے۔ لیکن ان کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں یہ بات ضرور چمکی ہوئی تھی کہ انتخابات پورے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے لئے ہوتے تھے۔ ۱۹۷۱ء کی جغرافیائی تبدیلی کے بعد عوام سے نیا اختیار نامہ لینا ضروری تھا جو وہ نہ لے سکے تھے۔ اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد وہ از سر نو انتخابات کے بارے میں غور کرتے رہے تھے لیکن ملکی اور بین الاقوامی حالات نے انہیں اس کی مصلحت نہ دی تھی۔ ان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ۱۹۷۱ء کی شکست کے اثرات سے قوم کو نجات دلانے اور نو بھارت کو بھارت سے وطن واپس لانے کا تھا جس کے لئے انہوں نے شہد معابد کیا۔ پھر فوراً بعد وہ اسلامی سربراہ کانفرنس کے انعقاد میں مصروف ہو

وزارت ابتدا میں انہوں نے حفیظ پیرزادہ کے حوالے کی تھی۔ لیکن سارا کام وہ بذات خود ہی کرتے تھے۔ وہ بڑا عجیب دور تھا۔ بچے در بچے، بحران پیدا ہو رہے تھے۔ چنانچہ جب وزیر اعظم نے یہ وزارت میرے حوالے کی اور واضح طور پر اپنے مقاصد بتائے تو مجھے یاد ہے کہ میں نے انہیں جواب دیا تھا کہ..... "میں ضابطہ کار اور سرکاری طور طریقوں سے بالکل واقف نہیں مقاصد کے حصول کے لئے راہ عمل کا تعین تو کر سکتا ہوں لیکن افسر شاہی کو شاید میں کنٹرول نہ کر سکوں اس پر مسٹر بھٹو نے جواباً کہا تھا..... "اس کی فکر نہ کریں، اصل ضرورت سیاسی سطح پر راستے تلاش کرنے کی ہے اور آپ میں اس کی صلاحیت موجود ہے رہا فنی طریق کار اور افسر شاہی سو میں ہر قدم پر آپ کے ساتھ ہوں۔" ان کی اس ہمت افزائی نے میرا حوصلہ بڑھا دیا اور درحقیقت انہوں نے اپنا یہ وعدہ نبھایا بھی۔ ہر قدم پر میری بھرپور اعانت اور رہنمائی کی جس کے نتیجے میں کچھ عرصے بعد ہی میرا شمار ان وزرائے ہونے لگا جو اپنے حکموں پر پوری گرفت رکھتے تھے۔ یہ بات اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہے کہ میرے زمانہ وزارت میں جنگلی قیدیوں سے متعلق عالمی رائے عامہ کو کس طرح منظم کیا گیا اور کتنی موثر مہم چلائی گئی۔ یہ مسٹر بھٹو ہی کی رہنمائی اور اعانت کا نتیجہ تھا۔ پھر بنگلہ دیش کی حقیقت کو تسلیم کرانے میں جذباتی رکاوٹوں کو دور کرنا اور شملہ معاہدہ کو قوم سے قبول کرانا کوئی آسان کام نہ تھا یہاں میں ایک انکشاف بھی کرنا چاہوں کہ شیخ مجیب الرحمن کی حکومت کے ساتھ پہلا براہ راست خفیہ رابطہ وزارت خارجہ کے توسط سے نہیں ہوا تھا بلکہ یہ فرض بھی میری وزارت نے نبھایا تھا۔ اس قسم کی حساس اور نازک کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد مجھ میں اعتماد پیدا ہوا جس کے بعد مسٹر بھٹو نے تمام معاملات میرے اوپر چھوڑ دیئے تھے۔ یہی سبب تھا کہ جب مسٹر بھٹو نے اس رات پھر انتخابات کی طرف اشارہ کیا تو میں نے اپنی وزارت کے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں راہ عمل کا تعین خود کر لیا تھا اور ایک ابتدائی خاکہ مرتب کرنے کے بعد..... ایک شام چائے کی میز پر وزیر اعظم کے سامنے اس بات کو اٹھایا۔

"جناب اسمبلیاں توڑنے کا اعلان کب کرنا چاہئے؟" میں نے ان سے پوچھا۔

"نہیں مولانا! ابھی ایسا نہیں ہو رہا" مسٹر بھٹو نے جواب دیا۔ ان کے لہجے میں کچھ مایوسی کی جھلک

تھی۔

"لیکن آپ تو تیرے کہتے ہوئے تھے۔" میں نے قدرے استہباب کے ساتھ پوچھا۔ "آپ تو بے

حد پر اعتماد تھے۔"

"اعتماد تو آج بھی ہے" وزیر اعظم نے سوچ میں ڈوبے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا کروں؟ دانشوروں

کی ٹیم نہیں مانتی! دانشوروں کی وہ ٹیم اب ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ ۷۷ء کے انتخابات میں اس ٹیم کے

دو افراد نے تو حصہ ہی نہ لیا تھا اور تیسرے نے جس طرح کامیابی حاصل کی وہ بھی ایک کھلارازے لڑکر یہ لوگ

اس وقت وزیر اعظم کے فیصلے کی حمایت کرتے تو انتخابات یقینی تھے اور کانفرنس کے بعد جو نفاض مسٹر بھٹو کے

گئے اتحاد عالم اسلام درحقیقت ہمارا ایک مشترکہ خواب تھا اور اس خواب کو حقیقت بنانے کے لئے سب سے زیادہ کوششیں بھی ہم نے ہی کیں۔ اس وقت بھٹو صاحب کے بعد اسلامی دنیا میں تھوڑی بہت جان پہچان و زلزلے کرام میں سے صرف میری ہی تھی اس لئے ہم دونوں کے سوا کوئی چاہتا بھی تو موثر کردار ادا نہ کر سکتا تھا۔ اس کانفرنس کے وسیع 'بمہ گیر' خلافتی اور عالمی مقاصد کے علاوہ ہمارے پیش نظر دو مقاصد اور بھی تھے اول انتخابات کا از سر نو انعقاد اور دوم بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا یہ راز کابینہ کے بہت سے وزرا کو بھی معلوم نہ تھا کہ اسلامی کانفرنس میں شیخ مجیب الرحمن کی شرکت اور بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا پہلے سے طے پا چکا تھا۔ لاہور کی ایک تقریب میں کانفرنس میں شریک تمام سربراہوں کی تصاویر لگائی گئی تھیں شیخ مجیب الرحمن کی تصویر بنا کر الگ رکھی گئی تھی۔ جو خود میری تحویل میں تھی اور اسے ان کی آمد کے بعد منظر عام پر لایا جانا تھا۔

کانفرنس توقعات سے کہیں زیادہ کامیاب رہی تھی میری تجویز پر باوشاہی مسجد لاہور میں تمام سربراہوں کا اجتماع اور نماز کی ادائیگی کے عمل نے قوم کے ان صدیوں پرانے خوابوں کو حیات بخشی جو اس خطے کے مسلمانوں کے اذہان کی گہرائیوں میں رہے بے ہوئے تھے۔ وہ ایک منظر بڑے بڑے مذہبی خطبوں سے زیادہ موثر تھا۔ دوسری طرف شیخ مجیب الرحمن کی آمد اور شمالا بارباغ میں پاکستانی شہریوں سے کھل مل جانے کے اثرات بڑے جذباتی نتائج کے حامل تھے۔ پاکستان کے مقبوضہ علاقے مسٹر بھٹو واگھزار کر اچکے تھے۔ جنگلی قیدیوں کی واپسی کا عمل شروع ہو چکا تھا اور یہ سب بڑے خوش گوار لمحات تھے۔ قوم پر طاری ندامت، خوف، ناامیدی اور کم ہمتی کی کیفیت چمٹ چکی تھی۔ دو سال کے عرصہ میں اس صورت حال نے جنم لیا تھا اور اسلامی کانفرنس اس کا نقطہ کمال تھا جب گلست خورہ پاکستانی قوم نے پورے عالم اسلام کو اپنے شانہ بندانہ محسوس کیا اس وقت اگر انتخابات کرادیئے جاتے تو پہلے پارٹی نئے پاکستان میں حکومت بنانے کا مستند اختیار بھی حاصل کر لیتی اور ان خرابیوں سے بھی نجات مل جاتی جو آگے چل کر حکومت کی تباہی اور رسوائی کا باعث بنیں۔

۱۵ ستمبر کی اس رات جب بھٹو صاحب نے مجھ سے میرا خیال پوچھا تو میں نے اس وقت کی کھلی جذباتی فضا کو مد نظر رکھتے ہوئے ہی انہیں پھر انتخابات کے انعقاد کا مشورہ دیا تھا۔ مسٹر بھٹو احمدی مسئلے پر قوی اسمبلی کا فیصلہ کرانے کے بعد انتخابات کے نقطہ نظر ہی سے سوچ رہے تھے۔ لیکن میرے خیال میں انتخابات کا سب سے بہترین وقت وہی تھا جب مسٹر بھٹو اسلامی سربراہ کانفرنس سے فارغ ہو چکے تھے اور اپنی شخصی مقبولیت کے نقطہ مدعوں پر تھے۔ کانفرنس کے کامیاب اختتام کے بعد اسلام آباد واپسی کے فوراً بعد میں نے انتخابات کے سلسلے میں غور و فکر شروع کر دیا تھا۔ ذرائع ابلاغ کی ذمہ داریاں اس وقت میرے پاس تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ سب سے زیادہ بوجھ ادھر ہی پڑے گا وزیر اعظم بھٹو وہی وزارتوں میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ ایک وزارت خارجہ اور دوسری وزارت اطلاعات و نشریات۔ اطلاعات و نشریات کی

حق میں بن چکی تھی اسے دیکھتے ہوئے انتخابات کے حق میں ان کا فیصلہ ایک بروقت صحیح اور درست ترین فیصلہ تھا۔ حفیظ اس وقت اس خیال کے سب سے زیادہ مخالف تھے۔ بعد ازاں جب ایک طویل عرصہ بعد قادیانوں کے بارے میں آئینی ترمیم سے فارغ ہو کر مسز بھٹو انتخابات کے امکانات کا جائزہ لے رہے تھے تو حفیظ پیر زادہ انتخابات کے حق میں سب سے زیادہ دلائل دے رہے تھے۔ وہ خود بھی خوش فہمی میں مبتلا نئے اور مسز بھٹو کو بھی یہ باور کرا رہے تھے کہ آئینی ترمیم نے مذہبی حلقوں میں ان کی مقبولیت کو اتنا سا کمال تک پہنچا دیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ مذہبی حلقوں کے بارے میں حفیظ کی معلومات خام ہیں اور جن بنیادوں پر وہ اس موقع پر مسز بھٹو کے ذہن میں انتخابات کے مرحلے سے نمٹ لینے کا خیال ڈال رہے تھے۔ وہ بنیادیں درست معلومات پر مبنی نہ تھیں۔ لیکن وزیر اعظم بھٹو حفیظ کے خیال سے متفق نظر آتے تھے۔ انہیں بھی اپنی مقبولیت کے بارے میں میری رائے سے اتفاق نہ تھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

”اب دوسری راستے واضح ہیں۔ اول یہ کہ موجودہ نفاذ سے فائدہ اٹھا کر فوراً انتخابات کرا دیئے جائیں، ورنہ ایک سال تک معیار بڑھانے کی آئینی رعایت سے فائدہ اٹھایا جائے ۱۹۷۸ء تک انتخابات کے لئے تیاریاں کی جائیں۔“

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں ذاتی طور پر دوسرے خیال سے متفق تھا۔ جب میں نے دوسرے پہلو سے اتفاق رائے ظاہر کیا تو مسز بھٹو نے مجھ پر طنز کیا..... ”آپ کو اپنے منتخب ہونے پر شک ہے؟“

”نہیں جناب!“..... میں نے جواب دیا۔ ”میرے ذہن میں اپنا خیال تک نہ تھا۔ اس طرف تو توجہ بھی آپ نے دلائی ہے میں نے تو دو سال پیشتر انتخابات کے انعقاد کی حمایت کی تھی۔ اگر اپنی نشست کا خیال ہوتا تو اس وقت بھی سوچتا۔“

نہیں! نہیں!! مسز بھٹو بولے۔ ”یہ تو مذاق تھا۔ آپ یہ بتائیں کہ اگر اس وقت اسمبلیاں توڑ کر انتخابات کا اعلان کر دیا جائے تو کتنے امکانات ہیں؟“

”جہاں تک اپوزیشن کا تعلق ہے، وہ اس وقت منتشر ہے، عوام کے ساتھ اس کے رابطے محدود ہیں بچا نعین کی کمزوری پر انحصار کیا جائے تو بلاشبہ موزوں وقت ہے لیکن ان کی کمزوری کو اپنی طاقت کیسے سمجھا جاسکتا ہے؟ ہماری اپنی پارٹی کی حالت قابل رشک نہیں ہمارے کارکنوں اور رہنماؤں نے باہمی رقابتوں اور تنازعات میں پڑ کر عوام کو مایوس کیا ہے۔ اگر آپ نے انتخابات کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو آپ کو ایک بار پھر خود ہی میدان میں اترنا ہو گا۔ ۱۹۷۰ء کا دور سامنے رکھ کر انتخابی مہم خود چلانا ہوگی۔ رابطہ عوام کے لئے آپ کو کم از کم پانچ چھ ماہ تک دورے کر کے ملک کے کونے کونے میں جانا ہو گا۔ آپ رابطہ بحال کریں لوگوں کی باتیں اور آراں کران کی روشنی میں پارٹی کی تنظیم نو کریں۔ اس طرح کامیابی کی امید کی جا

سکتی ہے۔“

وزیر اعظم نے بڑے اٹھناک سے میری باتیں سنیں اور پھر کچھ عرصہ بعد ہی انہوں نے کھلی پکھریوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ شاید یہ رابطہ عوام کا طریقہ تھا۔ پتہ نہیں یہ وزیر اعظم کا اپنا خیال تھا کہ کسی ”وائس ور“ کا آئینہ تیار ہونے کے بعد وزیر اعظم ہزار ہوں گے اور ایک محفل میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ..... ”اس شخص نے تو فطری شوٹنگ کرا دی ہے، ادا کاروں کا انتخاب بھی خود کرتا تھا اور انہیں مکالمے بھی خود دیتا تھا۔“

اس وقت تک حالت یہ ہو چکی تھی کہ وزیر اعظم خواہش کے باوجود عوام میں نہیں جاسکتے تھے۔ وہ گھیرے میں آچکے تھے اور یہ بات میں آج نہیں لکھ رہا۔ ”دیدور“ میں کھلی پکھریوں کا واقعہ پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ اس کتاب کے مسودے کا مطالعہ مسز بھٹو اور بیگم بھٹو نے اشاعت سے قبل کیا تھا۔

۱۹۷۶ء میں دفعتاً دفتری کاڑوائیوں کا آغاز ہو گیا۔ وزیر اعظم کے ہاں سے ایک حکم موصول ہوا کہ میں اپنی وزارت کی کارکردگی کے بارے میں پورے ایک ہفتہ کی پروپگنڈہ مہم تیار کر دوں ایسی طرح کا حکم دوسری تمام وزارتوں کو بھی جاری کیا گیا تھا۔ میں نے اس حکم کا مقصد جاننے کے لئے وزیر اعظم کو فون کیا تو انہوں نے اگلے روز مجھے ایوان وزیر اعظم میں بلوایا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے پوچھا۔

”آپ کو مقصد کا پتہ نہیں چل سکا؟ حیرت ہے!“ ”اندازہ تو ہو رہا ہے“..... میں نے دھیسے لہجے میں کہنا شروع کیا..... ”لیکن اگر ہم واقعی انتخابات کی طرف بڑھ رہے ہیں تو دفتری انداز میں کارکردگی کا ڈھنڈورہ پیٹ کر ہم کیا حاصل کریں گے۔“

”آپ کا خیال ہے ہماری حکومت نے کچھ نہیں کیا“ وزیر اعظم کے تئیں بڑے اور مجھے ان کا موڈ درست کرنے کے لئے کافی دیر تک اپنی بات کی وضاحت کرنا پڑی تاہم اس روز مجھے یقین ہو گیا کہ ”قائد عوام“ ایوان اقتدار میں اتنا عرصہ گزارنے کے بعد خود اپنے طور طریقے فراموش کر بیٹھے ہیں۔ میں یہ بات آج بھی سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایوب خان کے دس سالہ جشن کا مذاق اڑانے والے بھٹو نے آخر خود کیوں سرکاری ذرائع ابلاغ اور سرکاری ملازمین کے مرتب کردہ پروگراموں پر مشتمل ”ہفتوں“ کو عوامی رابطے کا ذریعہ مان لیا تھا۔

ملاقات کے اختتام تک ان کا موڈ قدرے بہتر ہو چکا تھا مجھے رخصت کرتے وقت انہوں نے کہا۔ ”انتخابات کا فیصلہ میں کر چکا ہوں۔ جو پہلا موزوں وقت ملا اس میں اعلان کر دیا جائے گا اور مولانا آپ کو بہت کام کرنا ہے۔ میں جلد ہی سارے انتخابی معاملات آپ کے حوالے کرنے والا ہوں“ تیاری کر لیجئے۔ ”وزیر اعظم نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملا یا۔ ”میں ہمہ وقت مستعد ہوں گا“..... میں نے جواب دیا۔

چونکہ میں انتخابی مسم کے دفتری انداز پر اعتراض کر چکا تھا اور بہنو صاحب نے اسے اپنی طرف منسوب کر لیا تھا، اس لئے اب مجھ پر لازم تھا کہ میں اپنی طرف سے سیاسی انداز کی مسم کی تیاریاں کرتا میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر بیک وقت کئی محاذوں پر کام شروع کر دیا اور زیادہ زور اس چیز پر دیا کہ وزیر اعظم خود اسپتالی کے ہر حلقے میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور جائیں۔ اس سلسلہ میں ہر جگہ کے حالات سے وزیر اعظم کو باخبر رکھنے کے لئے میں نے ایک سوالنامہ تیار کرایا جو میں پارٹی کارکنوں کو بھیجنا چاہتا تھا۔ تاکہ موصول ہونے والے جوابات کی روشنی میں وزیر اعظم کی جانب سے انکھار خیال کے دوپہر اگر ان تیار کر کے لئے جائیں اور دوسرے انہیں ہر علاقے کے معاملات مسائل سے بھی براہ راست واقفیت ہو جائے۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ وزیر اعظم کے دورے کا تمام تر انتظام پارٹی کے کارکنوں کے سپرد کر دیا جائے اور یہ ذرا سی بات۔ وزیر اعظم اور عوام کے درمیان موجود افسر شاہی کے پردے کو چھ سے ہٹا کر نونے ہوئے تمام رابطے بحال کر دیتی۔ اس بات کی اہمیت کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ وزارت عظمیٰ سے علیحدگی کے بعد جب وزیر اعظم افسروں کے جھرمٹ سے باہر آئے تو کارکنوں نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا، حالانکہ چند ہفتے قبل استقبال کے لئے اتنا بھی ہجوم اکٹھا نہیں ہوتا تھا جتنا مثال کے طور پر اگست ۱۹۷۷ء میں لاہور میں ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ افسر شاہی کو انتخابات سے علیحدہ رکھ کر عوام کے ساتھ سسر بہنو کے جذباتی رشتوں کا پر جوش اظہار کر سکوں اور ایک مرتبہ ایسا ہو جاتا تو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی رات مارشل لاد نافذ کرنے والوں کو بھی شاید اس اقدام کی جرأت نہ ہوتی میں سیاسی انداز میں انتخابی مسم چلانے کے منصوبے بنانے میں مصروف تھا کہ ۱۳ جولائی ۱۹۷۶ء کو وزیر اعظم کے سپیشل سیکرٹری راجو عبدالرشید کا ایک مراسلہ ”ناپ سیکرٹ“ کی مرے کے ساتھ موصول ہوا۔ جو ہنس منظر میں نے ابھی بیان کیا ہے اسے پوری طرح سمجھنے کے لئے مناسب ہو گا کہ اس مراسلے کا مطالعہ کر لیا جائے اصل مراسلہ انگریزی میں ہے اور اسے آپ کتاب کے آخر میں دیئے گئے ضمیمہ جات میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

○ ○ ○

Scanned by iqbalmt@urdu-forum.com



۱۳ جولائی ۱۹۷۶ء

ذیر مولانا صاحب!

وزیر اعظم نے مسرت کے ساتھ آپ کو آنے والے انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کی پریس پبلسٹی مسم کا سربراہ مقرر کیا ہے۔ آپ ازراہ کرم مقصد ہذا کے لئے ایک چھوٹی سی کمیٹی بنائیں جس میں ایسے تجربہ کار افراد شامل ہوں جو پارٹی کے اصولوں اور نظریات پر پختہ یقین رکھتے ہوں اور ان کے ساتھ پوری طرح وابستہ ہوں۔ ایسے افراد جو فنی مہارت کے حامل تو ہوں لیکن ان کی وفاداریاں کس اور ہوں انہیں شامل نہ کیا جائے۔ اسے ایک متوازن ٹیم ہونا چاہئے جس کا جھکاؤ نہ تو بائیں بازو کی طرف ہو اور نہ دائیں بازو کی طرف۔ آپ ان افراد کو یاد کر میں جنہوں نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پارٹی کی مدد کی تھی۔ جب آپ کمیٹی تشکیل دیں تو دفترانی نمائندگی کا خیال رکھیں تاکہ پارٹی کی اپیل کا نٹانی (پونڈورسل) ہو۔ براہ کرم ٹیم کے اراکین کی فہرست سے مطلع کریں تاکہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے وزیر اعظم سے منظوری حاصل کی جائے۔

ایک ٹیم وزیر اعظم کی ذاتی تشییر اور پروڈیکشن کے لئے قائم کی گئی ہے۔ یہ کمیٹی مسز سوسفٹی کے ماتحت کام کرے گی۔ لیکن دونوں ٹیموں کے درمیان رابطہ رہنا چاہیے اور وزیر اعظم نے مسرت کے ساتھ کو آرڈی نیٹر کی ذمہ داری بھی آپ کو سونپی ہے۔

آپ کا مخلص

راجو رشید

اصل متن کیلئے ملاحظہ ہو جبرجہات

وزیر اعظم کا حق تھا کہ اپنی ضرورت کے تحت جسے چاہیں اپنا معاون بنائیں اور جسے جو فرائض مناسب سمجھیں سونپ دیں لیکن اپنی جماعت کے ساتھیوں سے کم از کم پارٹی معاملات کی حد تک ان کا تعلق سیاسی ہونا چاہئے تھا۔ راجیو چند پولیس سروس کے آدمی تھے، ان کی جانب سے پارٹی کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات کو پہلی سیم کے سلسلے میں ہدایات جاری کی جا رہی ہیں۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے جس لیڈر نے ایک نئی پارٹی کی بنیاد رکھ کر اسے منظم کیا جس کی ذاتی مقبولیت نے ملک کے کروڑوں ووٹروں کے دل جیتے۔

جس کی ذاتی کارکردگی کے بارے میں گزشتہ ۵ سال سے ریڈیو ٹیلیوژن اور اخبارات عوام کو آگاہ رکھ رہے تھے۔ اس کی ”ذاتی تشہیر اور پروموشن“ کے لئے ”کمپنی“ قائم کی گئی۔ یہ ”تربیب“ کسی انسانی غیر سیاسی ذہن کی پیداوار ہو سکتی تھی۔ ہم لوگ وزیر اعظم کی ذاتی مقبولیت کو پارٹی کا سرمایہ تصور کرتے تھے اور مشیران کرام ان کی ”پروموشن“ کے لئے ”کمپنی“ بنا رہے تھے۔ انتخابی مہم کو ”یونیورس“ بنانے کا نادر اور اچھا تاخیال بھی کسی پولیس مین کے ذہن میں آسکتا ہے کوئی سیاسی آدمی تو بھنوسا صاحب کو ”یونیورس“ میں لے جا کر الیکشن نہیں لڑا سکتا تھا۔ پولیس کا زیر ملازمت افسر مجھے نظریاتی ہدایات بھی جاری کر رہا تھا۔ دائیں اور بائیں بازو میں توازن کا درس دے رہا تھا۔ فطری بات تھی یہ خط پڑھ کر طبیعت کمزور ہوئی۔ میں نے ایک ملاقات میں وزیر اعظم سے پھر گذارش کی کہ ہمیں پارٹی کی انتخابی مہم کو سیاسی ذرائع سے چلانا چاہئے، افسر سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن دو کام ان کے بس میں نہیں ہوتے، ایک ووٹر کو پولنگ بوتھ تک لانا اور دوسرے انتخابی فضا پیدا کر کے اس میں سے سرخرو دکھانا۔ میری بات کی تصدیق بعد کے دو واقعات بھی کرتے ہیں۔ رلیفڈم سرکاری ملازمین کا شو تھا اور انتخابات ۱۹۸۵ء سیاسی کارکنوں کے مابین تھے۔ دونوں کا فرق صاف ظاہر ہے۔

وزیر اعظم نے میری معروضات کو ”ذاتی خواہشات“ کا نتیجہ سمجھا۔ چنانچہ وضاحت کرنے لگے کہ مجھے مکمل انتخابی مہم کا سربراہ کیوں نہیں بنایا گیا۔ اس وقت تک مسٹر بھنوسا مشورے کے پس پشت مفاد کا شک کرنے لگے تھے۔ مجھے اصرار عبث نظر آیا، چنانچہ میں نے خود ہی کہہ دیا..... ”بہر حال آپ نے جو انتظامات کئے ہیں بہتر ہوں گے، اس سلسلے میں میرے سپرد جو خدمت کی گئی ہے، خلوص سے سر انجام دوں گا، میں تمہیں ہی راؤ صاحب کے حکم کی تعمیل کر دیتا ہوں۔“

”مولانا راؤ کا نہیں میرا حکم ہے..... اس نے تو میری جانب سے آپ کو مراسلہ لکھا ہے“

وزیر اعظم نے گویا مجھے تنبیہ کی۔

بیورو کرسی کے نرنغے میں

۱۹۷۰ء کے صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے انتخابات جن حالات میں ہوئے، وہ کم از کم ہمارے لئے نارمل نہیں تھے۔ پارٹی ابھی تشکیل کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ انتخابی سیاست کا سے کوئی تجربہ نہ تھا۔ انتخابات آئے تو حالت یہ تھی کہ عوامی سطح پر تو پارٹی کی مقبولیت بڑھ گئی تھی لیکن قیادت کی صفیں غیر منظم تھیں۔ ایک چیئرمین کی ذات تھی۔ یا ان کے چند قریبی احباب نام کے لئے مجلس عاملہ اور کمیٹیاں تھیں لیکن انہیں سیاسی فیصلے کے اختیارات نہیں تھے۔ انتخابات کے لئے میدان میں اترتے وقت یہ سوال درپیش تھا کہ ایسے امیدوار کہاں سے لائیں جو ووٹوں کے اس سرمائے کو جو پورے ملک میں بکھرا ہوا ہے سمیٹ سکیں۔ جو افراد میسر آئے انہیں ٹکٹ دے دیئے گئے۔ انتخابی میدان کے نووارد کامیابی کے بعد پوکھلا گئے اور ان کی حالت ایسی تھی جیسے ”شیدا“ ”مینیٹری“ میں آن پھنسا ہو۔ روایتی انتخابی گھرانوں کے جو افراد چیمپلز پارٹی کے ٹکٹ لینے آئے ان کا تعلق اپنے خاندانوں کی صف اول سے نہیں تھا۔ چند ایک نمایاں لیڈروں کو چھوڑ کر اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو پارٹی پر ایک بوجھ تھے، جن کے سامنے ”پلاٹ اور پرمٹ“ سے بڑھ کر عظیم مقاصد تھے ہی نہیں یونق تھا کہ ۱۹۷۳ء میں انتخابات کرا کے یہ بوجھ اتار دیا جاتا۔ ۱۹۷۷ء میں بھی بوجھ تھا جو درحقیقت پارٹی کو لے ڈوبا۔ ایک اہم بات یہ تھی کہ پنجاب اسمبلی میں مختلف گروپوں کے تنازعات منظر عام پر آچکے تھے۔ گروہ بندی شدید ہو چکی تھی۔ نئے انتخابات کے ذریعے اس گروہ بندی سے بھی بچھکارا پایا جاسکتا تھا۔ اس طرح وہ صورت حال پیدا نہ ہوتی جس کے نتیجے میں بعد ازاں لاہور کے حلقہ نمبر ۱۶ ایسے واقعات رونما ہوئے اور ایک مضبوط حکومت کی فیصلی میں درحقیقت پہلی وراڑ پڑی۔ یہ انتخابات ۱۹۷۴ء ہی میں اس وقت ہو جاتے جب اسلامی سربراہ کانفرنس ختم ہوئی تھی تو بھنوسا صاحب کو ۱۹۷۹ء تک حکومت کرنے کا بینڈ ٹیٹ مل جاتا اور وہ اسمبلیوں کی تفسیر بھی کر سکتے تھے۔ مجھے یاد ہے وزیر اعظم کو اپنی صفوں میں جوہر قابل کی کمی کا شدت سے احساس تھا اور انتخابات کے فیصلے کے پس منظر میں ان کا یہی احساس کارفرما تھا۔ سربراہی کانفرنس کے فوراً بعد انتخابات پر میرے اصرار کی وجہ یہ تھی کہ بھنوسا صاحب کے پورے دور میں میرے نزدیک وہ ان کی مقبولیت کا نقطہ عروج تھا۔ اگر اس وقت انتخابات ہو جاتے تو مسٹر بھنوسا اور چیمپلز پارٹی دو تہا پہا سے ہیں زیادہ اکثریت سے جیتتے۔

اگست ۱۹۷۶ء میں ہنری کسنجر نے وزیر اعظم کو جو دھمکی دی تھی، وہ اپنی جگہ کتنی ہی سنجیدہ کیوں نہ ہوتی مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ یہ صرف اس لئے ہوا کہ فرانس کے ساتھ معاہدہ کے اگلے ہی سال انتخابی مہم آگئی۔ میرا یقین ہے کہ کوئی بیرونی قوت کتنی ہی بااثر کیوں نہ ہو حالات پیدا کرنے کی اہل نہیں ہوتی حالات ہم خود پیدا کرتے ہیں۔ بیرونی قوتیں اپنے اپنے مفادات کے ماتحت ان سے فائدے اٹھاتی ہیں۔ ری پراسیسینگس پلانٹ کی خریداری کا معاہدہ اور انتخابات کے انعقاد کے سلسلے میں وقت کا تعین بڑا اہم ہے یہ معاہدہ انتخابات کے فوراً بعد کرنا چاہئے تھا۔ چاہے ۱۹۷۴ء میں انتخابات کرانے کے بعد یا پھر ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد اس طرح حکومت کو نتائج کا سامنا کرنے کے لئے چار سال کا محفوظ عرصہ مل جاتا۔ یہ واضح کر دوں کہ میں یہ تبصرہ آج کر رہا ہوں اس وقت جب میں نے ۱۹۷۴ء میں انتخابات کرانے کا مشورہ دیا تھا یہ باتیں میرے پیش نظر نہیں تھیں بلکہ میرے پیش نظر تو صرف مسٹر بھٹو کی ذاتی مقبولیت کا گراف تھا۔ جس کی حالت اب یہ ہو چکی تھی کہ اس کی ”پروجیکشن“ کے لئے ”کیٹیاں“ تشکیل دی جا رہی تھیں۔ یہ ”راز“ تو مجھ پر بھی بست بعد میں کھلا کہ راؤ عبدالرشید اور ان کی قبیل کے دیگر مشیران کرام پر مشتمل درحقیقت کتنی ”کیٹیاں“ تھیں جو ۱۹۷۷ء کی انتخابی مہم کے لئے اپریل ۱۹۷۶ء سے کام کر رہی تھیں۔ انتخابات کے لئے ”نمونے کا جو منصوبہ“ خود وزیر اعظم نے تیار کیا تھا اس کی بنیاد ہی نوکر شاہی پر تھی۔ جس کے اہم ستون راؤ عبدالرشید کے علاوہ افضل سعید خان، وقار احمد، سعید احمد خان، مسعود محمود، محمد حیات مٹن (مشیر برائے عوامی امور) مسٹر اکر م شیخ (ڈائریکٹر انٹیلی جینس بیورو) مسٹر سعید احمد قریشی چیف سیکرٹری سندھ، مسٹر محمد خان جو نیچو، ہوم سیکرٹری سندھ، بریگیڈیئر (رٹائرڈ) ملک مظفر خان چیف سیکرٹری پنجاب، مسٹر منیر حسین چیف سیکرٹری صوبہ سرحد، مسٹر نصر من اللہ چیف سیکرٹری بلوچستان، میجر جنرل امتیاز علی لٹری سیکرٹری برائے وزیر اعظم، مسٹر حامد جلال ایڈیشنل سیکرٹری برائے وزیر اعظم تھے۔ یہ گویا وزیر اعظم بھٹو کی ”منی کیبنٹ“ تھی جو ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے منصوبے ”آپریشن وکٹری“ کی اصل خالق تھی۔ وفاقی وزیر پیداوار مسٹر رفیع رضا پوری انتخابی مہم کے انچارج تھے لیکن وزیر اعظم کے منصوبے کے مطابق درجہ درجہ پارٹی کی انتخابی مہم ڈپٹی کمشنروں، ایس۔ پی صاحبان اور تحصیل واردوں سے لے کر پڑوسیوں تک کے کانڈروں پر تھی۔ پیپلز پارٹی کے کارکنوں یا رہنماؤں کو انتخابات کی ذمہ داریوں سے سیکرٹریہ کر دیا گیا تھا اور پوری پارٹی افسر شاہی کے کنٹرول میں تھی۔ جس کی ایک مثال میں نے گذشتہ باب میں اپنے نام راؤ عبدالرشید کے خط کی صورت میں پیش کی ہے۔ یہ ستم ظریفی کی انتہا تھی کہ جو پیپلز پارٹی انتہائی نا تجربہ کاری اور سپیڑی کے عالم میں بھٹو صاحب کو ایوان اقتدار میں لے کر آئی اسی پر دوسری مرتبہ چیئر مین کو اعتماد نہ تھا بلکہ وہ بیورو کرکسی ان کے نزدیک زیادہ لائق اعتبار تھی جسے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں چاروں شانے چت کر کے وہ برسر اقتدار آئے تھے۔ بیورو کرکسی نے اس عرصے کے دوران نہایت خاموشی اور صفائی سے ایک طرف تو مسٹر بھٹو کا عوام سے

رابطہ کاٹ دیا تھا اور انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا تھا جبکہ دوسری طرف اس نے پیپلز پارٹی اور اس کے پر جوش کارکنوں کا چیئر مین کے سامنے بھرم اور وقار ختم کر دیا تھا۔ ایک طرف بیورو کرکسی پارٹی کے کارکن کو کوئی پوسٹ ’لانسٹنس‘ یا پلاٹ دیتا تھا اور دوسری طرف اس کی فائل کھول کر چیئر مین تک پہنچا دیتا تھا جس سے پارٹی کارکنوں کی بدعنوانیاں ثابت ہوتی ہوں۔ پارٹی کے جیسے لے کارکن تو بیورو کرکسی کے اس کھیل کو کیا سمجھتے خود چیئر مین اس چال سے مات کھا گئے اور رفتہ رفتہ اس قدر افسر شاہی کے حصار میں پٹے گئے کہ ان کے نزدیک پارٹی کا وجود اور عدم ایک برابر ہو گیا۔ پارٹی سے متعلق ہر فرد پر انہیں مفاد پرست ہونے کا شک ہوتا تھا یہی وجہ تھی کہ انتخابات کے مرحلے پر انہوں نے سیدھے سبھاؤ پارٹی کی قوت اور عوام پر اعتماد کر کے انتخابات میں حصہ لینے کے بجائے ان ”خفیہ اقدامات“ کا سہارا لیا، جو راؤ عبدالرشید اینڈ کمپنی کی پیشکش تھی۔ اس سلسلے میں درحقیقت کیا کچھ ہوا، مجھے اس کی تفصیلات کا علم اس لئے بھی نہیں کہ میں اس سارے خفیہ کھیل ہی سے الگ تھلگ تھا اور میں نے پوری دیانت داری کے ساتھ پیپلز پارٹی کی انتخابی مہم کو سیاسی انداز ہی میں چلا دیا تھا۔

اس سلسلے میں میں نے ملک بھر میں بڑے بڑے جلسے کئے، جلسوں کی قیادت کی اور پیپلز پارٹی کی انتخابی مہم جو پئی۔ این ایس کی جماعتوں کے مقابل قدرے دلی دہلی سی تھی۔ اسے پیپلز پارٹی کا مخصوص جارحانہ رنگ روپ دیا۔ پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی دفاعی پوزیشن کو ختم کیا۔ ایک ایک دن میں کئی کئی شہروں میں مختلف جلسوں سے خطاب کے ساتھ میں وزارت کی فائلوں کو بھی بھٹکارا ہا تھا اور مجھے فخر ہے کہ برائے مسٹر سیکرٹریٹ کے بعد میری وزارت کا یہ ریکارڈ تھا کہ وہاں کوئی فائل ایک دن سے زیادہ کبھی نہ رکھی تھی۔ میں نے یہ ہنر بھی وزیر اعظم بھٹو سے سیکھا تھا۔ ان کی عادت تھی کہ رات گئے تک فائلوں کے مطالعہ میں ڈوبے رہتے اور بہت ہی کم ایسا ہوتا کہ کوئی فائل ان کے آفس میں ایک دن تک رکھی ہو۔ ورنہ عموماً وہ اسی روز فائل پر اپنے ریکارڈس یا احکامات لکھ کر متعلقہ محکمے کو واپس بھجوا دیتے تھے۔ میں نے اس معاملے میں ان سے زیادہ آہنی اعصاب کا مالک آدمی کم ہی دیکھا ہے۔

پریس بلیٹی کیٹیوں کی تشکیل کے سلسلے میں میں نے راؤ عبدالرشید کے مراسلہ کا جواب دیا جس میں ان افراد کے نام تجویز کر دیے جو مجھ سے مانگے گئے تھے۔ کمیٹی کے کام کے دائرہ کار اور اس کے عرصہ کار کے علاوہ میں نے کمیٹی کے ارکان کو او ایٹیکوں کے بارے میں بھی دریافت کیا تھا کہ ان کا معاوضہ کس طرح دیا جائے گا۔ اس کمیٹی میں چند معروف صحافی بھی شامل تھے۔ وزیر اعظم بھٹو پارٹی کے ترجمان اخبار مساوات کے بارے میں بہت زیادہ حساس تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میں اس اخبار کے سلسلے میں ذاتی دلچسپی لوں، اس سلسلے میں انہوں نے ۱۳ جون ۱۹۷۶ء کو مجھے جو مکتوب تحریر کیا، وہ ملاحظہ فرمائیے۔

ISLAM IS OUR FAITH
DEMOCRACY IS OUR POLITY
SOCIALISM IS OUR ECONOMY
ALL POWERS TO THE PEOPLE



ذیر مسٹر نیازی!

آپ جانتے ہیں کہ اردو روزنامہ مساوات کراچی، لاہور اور لائل پور سے میر جمیل الرحمن کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ میں نے آپ سے کئی مرتبہ کہا ہے کہ یہ پرچہ ہماری ذمہ دار شخصیات کی مدد اور عدم توجہی کی وجہ سے بہت سے مصائب کا شکار رہتا ہے اور اب بھی ہے۔ اب اس کا وہ مقام بھی نہیں رہا جو باضی میں ہوتا تھا۔ مساوات ہمارا اپنا اخبار ہے اور یہ آپ کی بھرپور مدد اور توجہ کا مستحق ہے صرف آپ کی ذاتی اور گہری توجہ اور دلچسپی ہی اسے ملک کے دیگر بڑے اخبارات کے مقابل لاکر اس کی پوزیشن بحال کر سکتی ہے۔ مساوات کو اب تک آپ کی وزارت اور آپ کی جانب سے جو مدد مل رہی ہے یہ اس سے کہیں زیادہ کا مستحق ہے۔ میں ایک مرتبہ پھر اس کے لئے آپ کی ذاتی دلچسپی کے حصول کا خواہاں ہوں اور چاہتا ہوں کہ وفاقی دار الحکومت اور صوبائی ہیڈ کوارٹرز میں آپ اس کے نمائندوں کی بھرپور مدد کریں جن کا تعین خود میں نے کیا ہے۔ یہ سب بڑے تجزیہ کار صحافی ہیں۔ دوسرے اخبارات کے صحافیوں کی نسبت یہ آپ کی زیادہ توجہ کے مستحق ہیں حکومت اور پارٹی کی پالیسیوں اور پروگراموں کے سلسلے میں ان کے ساتھ آپ کا تعاون بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر اخبار کا دوسرے اخبارات کے معیار تک آنا ناممکن نہیں ہے مجھے بھرپور یقین ہے کہ آپ اسے دوسرے بڑے اشاعتی اداروں کے اخبارات کے مقابل لانے میں کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہیں کریں گے۔ میں نے مساوات کے نمائندوں کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ آپ سے قریبی روابط رکھیں وہ آپ کے اشارے کے منتظر رہیں گے۔ براہ کرم اپنے قیمتی وقت میں سے حکومت اور پارٹی کی خاطر کچھ وقت مساوات کو دیں۔ اگر آپ ضرورت محسوس کریں تو مساوات کے مسئلہ پر جب چاہیں مجھ سے گفتگو کر لیں اور اس سلسلے میں کوئی جھجک محسوس نہ کریں۔

آپ کا قصص
ذوالفقار علی بھٹو

وزیر اعظم کی خواہش درحقیقت یہ تھی کہ انتخابی مسم کے باقاعدہ آغاز سے پہلے پارٹی کی پلیٹی کو موثر بنانے کے لئے مساوات کو ایک مرتبہ پھر ۱۹۷۰ء جیسی پوزیشن پر لے آیا جائے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ ممکن ہی نہ تھا۔ کیونکہ گذشتہ چند سالوں میں مساوات کے پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا تھا اور اخبار بوجہ اپنی کڑی پالیسی سے محروم ہو چکا تھا جو ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اسے حاصل تھی۔

وزیر اعظم انتخابات سے قبل پارٹی اور حکومت کی پلیٹی مسم کے بارے میں کس درجہ حساس تھے اس کا اندازہ ایک اور مراحل سے کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے لاہور میں اپنے قیام کے دوران ۲۲ دسمبر ۱۹۷۶ء کو نمبر ۷۶ (بی۔ ایم، پی۔ ایس۔ بی۔ ۱۲۰۳۔ ڈی کے تحت مسٹر رفیع رضا، مجھے، وزیر اطلاعات حنیف خان اور چاروں صوبوں کے وزراء نے اعلیٰ کو بھجوایا تھا۔ مکتوب کے مطابق کسی نامعلوم مبصر نے ان کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تو انہیں بھی احساس ہوا کہ پارٹی کی پروپیگنڈہ مسم میں بھانڈوں کو بھی منظم کیا جائے چاہئے اس مکتوب کا مکمل انگریزی متن بھی آپ ضمیمہ جات میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

○ ○ ○

Scanned by iqbalmt@urdu-forum.com

اصل متن کیلئے ملاحظہ ہو نمبر جات



۱- ایک بیرونی مہم نے جو بلاشبہ ایشیا کو سمجھنے کی تیز صلاحیت رکھتے ہیں لکھا ہے۔

اطلاعات کی وقتی اور صوبائی وزارتیں مہم کی ضروریات پر شاید ہی پوری اتر سکیں بہت سے باورچیوں کی طرح وقتی وزارت اطلاعات اس قدر غبی اور کند ذہن واقع ہوئی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ سارے کام کا سنبھال کر دے۔ صوبائی میکریٹنٹس خصوصاً طاقت کے منبع صوبہ پنجاب کی حالت موزوں افراد کے لحاظ سے نہایت قابل رحم ہے اب تک مجھے یقین ہو چکا ہے کہ کسی نے بھی عام انتخابات اور پیپلز پارٹی کی حکومت کے ثمرات کے بارے میں کچھ سوچنے کی زحمت تک نہیں کی۔ ہمیں جیسے وزیر اعظم کو تنہا لوگوں کو یہ بتانا پڑا ہے کہ گذشتہ حکومتوں کے دور میں صوبوں کی کیا حالت تھی اور اب انہیں کیا کچھ حاصل ہو رہا ہے۔ ملک میں کس قدر منصوبہ زیر عمل ہیں۔ پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں کھولے جانے والے سکولوں، کالجوں اور ہسپتالوں کی تعداد کیا ہے۔ اساتذہ اور ڈاکٹروں وغیرہ کو کس قدر فائدہ پہنچا ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کو کیا کچھ حاصل ہوا ہے۔ ان چیزوں کے بارے میں اعداد و شمار اور نشستوں کے حامل پوسٹر کماں ہیں؟ اس ضمن میں کس قسم کے مضامین لکھے جانے چاہیں، کارٹون کیسے ہونے چاہیں اور تشیری مہم کیسے منظم کی جانی چاہئے اور حزب اختلاف کا خاکہ کیسے اڑانا چاہئے، یہ سب کچھ اور اس کے علاوہ حزب اختلاف کے خلاف ہر گیسے اور ضلع میں اپنا ہیں پھیلانے کے میل اور مراغہ سامنی کے مرکز کو ملے اور چلائے جانے چاہئیں۔ اس وقت تک انتخابی مہم کے موضوع کے بارے میں غور و فکر اور ہر ضلع کے انفرادی سروے عمل ہو جانا چاہئے تھا۔ یہ سب کچھ کیوں نہیں کیا گیا؟

۲- اس تحریر کے مصنف کو بلاشبہ آئندہ انتخابات کے بارے میں کی جانے والی ہماری تیاریوں کا علم نہیں، تاہم ہم جو اقدامات کر رہے ہیں اگر ان کے نتائج ظاہر ہوئے تو کوئی اندرونی اور بیرونی مہم اس طرح محسوس نہیں کرے گا جس طرح وہ کرتا ہے جس آپ کی طرح اس کی پیش کردہ تجاویز پر غور و فکر کرنا اور جہاں تک آپ کی ذمہ داریوں کا تعلق ہے ان پر عمل کرنا چاہوں گا۔ ہمیں اطلاعات اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے عوام کو عوامی حکومت کے ثمرات کے بارے میں بتا کر کوئی موثر راستہ لگانا چاہئے۔ اس سلسلہ میں تمام وقتی اور صوبائی وزراء کی طرف سے اپنی اپنی دلچسپیوں اور ذمہ داریوں کے سلسلہ میں ذاتی سطح پر بات چیت اور وضاحت کرنا بھی شامل ہے۔ اس مہم نے جن خاصیتوں کی نشاندہی کی ہے عام لوگ ان سے بخوبی واقف ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ تمام مسائل کے بارے میں فراہم کی جانے والی معلومات کا اپنے ذہن وادراک سے بھی بڑھ کر خیر مقدم کریں گے۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ عوام کو مطلوب معلومات اس انداز سے فراہم کریں جس سے ان کی دلچسپی اور توجہ کو اٹھینٹ لے۔ کامرانوں اور مسائل کے

حتمی تجزیہ و تشریح سے ہم وہ مقاصد حاصل نہیں کر سکتے جو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اصل مقصد عوامی حکومت کی کامرانیاں اور کوششیں عوام کے سامنے متاثر کن انداز سے پیش کی جائیں تاکہ حزب اختلاف کی طرف سے کی جانے والی تنقید عوام کو مستحکم فیز نظر آنے لگے۔ اس طرح مخالفت کرنے والے عناصر خود بخود سمجھتے ہو جائیں گے اور عوام ہماری کسی ارادی کوشش کے بغیر انہیں ان کے اصلی رنگ میں دیکھنے لگیں گے۔

۳- مجھے تو یقین ہے کہ اس مختصری تحریر کے ذریعے میں نے آپ تک جو کچھ پہنچانے کی کوشش کی ہے وہ آپ کی سمجھ میں آ گیا ہو گا اور اب یہ میں آپ پر جموزتا ہوں کہ آپ خود فیصلہ کریں کہ آپ کو اپنے مخصوص حلقہ کاریں کیسے کام کرنا ہے۔

دعوت (وزیر اعظم)
کیسپ لاہور

وزیر پیداوار (مسٹر رفیع رضا)
وزیر برائے مذہبی امور (مولانا کوثر نیازی)
وزیر اطلاعات و نشریات (مسٹر محمد حنیف خان)
وزیر اعلیٰ پنجاب (مسٹر صادق حسین قریشی)
وزیر اعلیٰ سندھ (مسٹر غلام مصطفیٰ جتوئی)
وزیر اعلیٰ سرحد (مسٹر نصر اللہ خان خٹک)
وزیر اعلیٰ بلوچستان (مسٹر محمد خان باروزئی)

اہمی روز و شب کے ہنگاموں میں ۱۹۷۷ء سر پر آپنچا اور جنوری ۱۹۷۷ء کو وزیر اعظم کی جانب سے مجھے اپنی رہائش گاہ پر ایک مکتوب موصول ہوا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ ہمارا عرصہ اقتدار پورا ہو رہا ہے اور اب ہمیں انتخابات میں اترنا ہے۔ یہ مکتوب بغیر کسی ڈائری نمبر کے تھا اور دستی بھجوا یا گیا تھا۔ مکتوب کے آخر میں میری رہائش گاہ کا پتہ اور وزیر کی جگہ صرف ایم۔ این۔ اے تحریر تھا۔ گویا ہمارے لئے اطلاع تھی کہ اب ہم نکر لنگوٹ کس کر انتخابات کے میدان میں اتر آئیں۔ پہلے آپ یہ مکتوب مطالعہ کر لیں۔

○ ○ ○

Scanned by iqbalmt@urdu-forum.com



ذخیفہ

وزیر اعظم باڈس
راولپنڈی
۸ جنوری ۱۹۷۷ء

ماقی وزیر مولانا صاحب!

اب جبکہ ہماری پاکستان کے عوام کے منتخب نمائندوں کی معیار جس کے دوران مجھے ملک کے چیف ایگزیکٹو کے طور پر اپنے وطن کی خدمت کرنے کا موقع نصیب ہوا، فتم ہونے والی ہے، میں ان اہم سالوں کے دوران آپ کے تعاون اور اعانت کیلئے اپنی گرجوش اور مخلصانہ تعریف کا اظہار کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک نونے پھونے تکست خور وہ اور بے حوصلہ ملک کی عنان حکومت میرے ہاتھوں میں سونپ دی اور اس کی تعمیر نو کی رہنمائی کرنے کے عظیم کام کا بوجھ میرے کندھوں پر ڈال دیا۔ یہ ایک نہایت ہمت شکن چیلنج تھا، لیکن میں نے اہند پر اعتماد اپنے ہم وطنوں کی دعاؤں اور اپنے ساتھیوں کی مدد و اعانت کے بحمدہ براسے قبول کر لیا۔ کوئی فرد غلطیوں اور خامیوں سے میرا نہیں ہوتا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ہوگی، تاہم میں یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ میں اس سے زیادہ بہتر طور پر کچھ کر سکتا تھا، لیکن جو بھی خامیاں رہی، ہوں وہ اس لئے نہیں تھیں کہ میری کوششوں میں کوئی کمی رہی ہو۔ سب سے وقت کا ہر لمحہ اور میری توانائی کا ہر قطرہ خدمت و وطن کیلئے صرف ہوا۔ بعض اوقات رکاوٹیں بھاہرنا قابل تفسیر نظر آتی تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم نے ان پر قابو پایا اور دنیا نے ہماری قوم میں اوپر اٹھنے کی جو قوت پائی جاتی ہے اس کا اظہار اپنی آنکھوں سے کیا۔ میں بڑے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ محبت و وطن قوتوں کے تعاون سے قومی وقار پوری طرح سے بحال کیا جا چکا ہے اور میرے وطن کے عوام نفسیاتی طور پر پوری طرح سے بحال ہو چکے ہیں۔

گزشتہ پانچ سالوں کے دوران میں جو دور رس تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں ان کی مثال ہمارے ملک کی کسی سابقہ حکومت کے دور حکومت اور نہایت ترقی یافتہ ممالک میں بھی نہیں ملتی۔ یہ تبدیلیاں ہماری قومی زندگی میں بوری طرح سرایت کر چکی ہیں اور یہ تبدیلیاں ان مفاد پرست عناصر کی کٹر مخالفت کے باوجود لائی گئیں جو پاکستان کو اپنے پنچل میں لئے ہوئے تھے۔ اب تبدیلی کی ہوا ہماری حسین سرزمین کے آریار محو خرام ہے۔ ابھی ہمیں پاکستان کو اپنے تصور کے مطابق ترقی اور خوشحالی کے ڈھانچے میں ڈھالنے کیلئے طویل سفر درپیش ہے۔ ابھی ہمیں عام شہری کو یہ محسوس کرانا ہے کہ وہ معاشرے کا انوٹ اور ہم پایہ حصہ ہے۔

چنانچہ اسی راہکار ڈکی بنیاد پر میں اپنے رائے و ہند گان کے پاس دوسری معیار کیلئے اعداد کا دوٹ حاصل کرنے کیلئے جا رہا ہوں تاکہ ہمتہ حاشرے میں جس معاشرتی و معاشی انصاف کی بنیاد رکھی ہے اور جو ابھی تک اپنی جزیں مضبوط بنانے کے عمل سے گزر رہا ہے اسے کامیابی سے منظم کیا جاسکے۔ اگرچہ مجھے پوری

طرح سے اعتماد ہے کہ میرے اہل قوم فیصلہ کریں گے اور پوری دانائی سے فیصلہ کریں گے تاہم اپنے حکمران منتخب کرنے کا انہیں حق ہے۔ اگر وہ کوئی مختلف فیصلہ کرتے ہیں، مجھے کوئی تاسف نہیں ہو گا اس پر بھی میرے محسوسات میں یہ فخر شامل ہو گا کہ مجھے شدید ضرورت کے وقت قومی خدمت کیلئے پکارا گیا اور میں نے قوم کو یاس نہیں کیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی دوبارہ برسرِ اقتدار آتی ہے یا نہیں اور ہمیں دوبارہ مل کر اپنے عوام کی خدمت کرنے کا موقع ملتا ہے یا نہیں یہی تاریخی لمحہ کے آزمائشی دور میں آپ نے میرا جو ساتھ دیا اس کیلئے میں اس موقع پر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

پاکستان ہندو باد

آپ کا مخلص

دعوت (ذوالفقار علی بھٹو)

مولانا کوثر نیازی

رکن قومی اسمبلی

۲۹۳/ایف۔۶/۳۱۳۱ سلام آباد

اس مکتوب کے ملنے کے بعد میں نے پہلی سیل کا قائم مقام انچارج شیخ حامد محمود مرحوم کو بتایا اور خود اپنے دوروں اور جلسوں کے پروگرام وضع کرنے شروع کر دیئے اس سلسلے میں اپنے شیڈول سے وزیر اعظم کو میں نے پوری طرح آگاہ رکھا۔

۲۷ جنوری ۱۹۷۷ء کو میں نے اس سلسلے میں وزیر اعظم کو جو نوٹ لکھا اس پر وزیر اعظم نے جو بنا تحریر فرمایا۔ ”یہ کام جاری رکھیں میں آپ کی کامیابی کا خواہش مند ہوں۔“

قصہ دراصل یہ تھا کہ وزیر اعظم کو وزیر داخلہ خان عبدالقیوم خان مرحوم نے کافی خوفزدہ کر رکھا تھا کہ صوبہ سرحد میں علما کی سرگرمیاں حکومت کے بہت خلاف ہیں۔ علمائے گجڑے ہوئے ہیں وزیر اعظم نے مجھے حکم دیا کہ میں فوری طور پر صوبہ سرحد جاؤں اور علما کی سرگرمیوں کا تدارک کر دوں۔ میں نے اس سلسلے میں ۲۳ دسمبر ۱۹۷۶ء کو وزیر اعظم کو ایک رپورٹ بھیجی جس کا ترجمہ یہ ہے۔

○ ○ ○ .



حکومت پاکستان
وزارت مذہبی امور، اقلیتی امور و سمندر پار پاکستان

یادداشت برائے وزیر اعظم

موضوع = صوبہ سرحد میں علماء کی خلاف عوام سرگرمیاں

حال ہی میں وزیر اعظم نے مجھے قسم دینا تھا کہ مجھے صوبہ سرحد میں عوام اور حکومت کے مخالفانہ مصروفیات میں ملوث علماء کی سرگرمیوں کے سدباب کیلئے مناسب اقدامات کرنے چاہئیں۔ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ بہت سے علماء و ثقافتی اہل اعتراض اور حکومت مخالف تقاریر کر رہے ہیں۔

۲۔ وزیر اعظم کے حکم کی تعمیل میں، میں پشاور گیا اور ایک اجلاس بلا یا جس میں درج ذیل حضرات نے شرکت کی۔

(۱)۔ عبدالرزاق خان، صوبائی وزیر صوبہ سرحد

(۲)۔ سیرٹری اوقاف، حکومت صوبہ سرحد

(۳)۔ سنٹرل انٹیلی جنس ایجنسی کا ایک نمائندہ

(۴)۔ ڈپٹی انسپکٹر جنرل (سٹیبل پولیس) صوبہ سرحد

۳۔ اس اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ پہلے سرحد میں تین حصوں پر مشتمل صوبہ سرحد کے علماء کی ایک مفصل فرسٹ فوری طور پر تیار کی جائے۔

(۱)۔ ان علماء کی فرسٹ ہو حکومت کے مخالف ہیں۔ اس فرسٹ کے دو حصے ہوں گے۔

(الف) ان علماء کی فرسٹ جن کی وابستگی عوام مخالف عناصر اور حزب اختلاف کی

جماعتوں کے ساتھ ہے۔

(ب)۔ ان علماء کی فرسٹ جو حکومت کی مخالفت کسی غلط فہمی کی بنا پر کرتے ہیں لیکن

ان کا عوام مخالف اور حزب اختلاف کی جماعتوں سے کوئی تعلق نہیں۔

(۲)۔ ان علماء کی فرسٹ جو غیر جانبدار ہیں اور جن کی کوئی سیاسی وابستگی نہیں۔

(۳)۔ محکمہ اوقاف کے علماء کی فرسٹ۔

۴۔ اجلاس میں مزید فیصلہ کیا گیا کہ میں جلد از جلد صوبہ سرحد کا دورہ کروں۔ چنانچہ میں نے پشاور ڈویژن

کے علماء سے خطاب کرنے کیلئے ۳ جنوری ۱۹۷۷ء کو پشاور جانے کا پروگرام بنایا ہے۔ اس اجتماع میں محکمہ اوقاف کے علماء کے علاوہ وہ علماء شرکت کریں گے جن کی حزب اختلاف کی جماعتوں اور عوام مخالف عناصر سے کسی قسم کی وابستگی نہیں ہے۔ یہ اجلاس سوال جواب کی طرز پر منعقد کیا جائے گا تاکہ علماء کے ذہن میں کوئی غلط فہمی ہو تو اسے رفع کیا جاسکے۔ ان اجلاسوں کی کسی قسم کی تشہیر نہ کرنے کی تجویز ہے۔ میں معروف علماء سے ذاتی طور پر بھی ملوں گا اور محکمہ اوقاف کے خطیبوں اور آئندہ سمیت ان کو سمجھانے کی کوشش کروں گا تاکہ ان کے ذریعے حزب اختلاف سے متعلق علماء کے پروپیگنڈا کا توڑ کیا جاسکے۔ پشاور اور صوبہ سرحد کے دوسرے مقامات پر علماء کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کے دوران میں ان کے مسائل حل کرنے کیلئے مانی اور ہر قسم کی دوسری ممکن امداد کی پیشکش کروں گا لیکن اگر اس کے باوجود حکومت کے بارے میں ان کا رویہ معاندانہ رہتا ہے تو پھر ان سے نمٹنے کیلئے ان کو انتظامیہ کے حوالے کر دیا جائے گا۔

۵۔ ۵ جنوری کو میں مردان ڈویژن کے علماء سے خطاب کرنے مردان جاؤں گا۔ ۹ اور ۱۰ جنوری کو میں ڈیرہ اسماعیل خان کے علماء کو جن میں بنوں کے علماء بھی شامل ہوں گے خطاب کرنے کی تجویز پیش کرتا ہوں مجھے پارٹی کے کارکنوں کی طرف سے ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک جلسہ عام سے خطاب کی دعوت بھی مل چکی ہے۔ یہ کام وزیر اعظم کی منظوری سے کیا جائے گا۔

۶۔ صوبائی حکومت کی رپورٹوں کے مطابق ہزارہ ڈویژن میں کسی قسم کی شرابگیزی نہیں ہے، لہذا میں فوری طور پر اس ڈویژن کا دورہ کرنے کا مشورہ نہیں دیتا، تاہم اگر اس ڈویژن میں کسی قسم کی مشکل کے بارے میں وزیر اعظم کو علم ہو تو میں یقیناً ہزارہ کا دورہ بھی کروں گا اور صورتحال سے نمٹنے کیلئے تمام مناسب اقدامات کروں گا۔

۷۔ صوبہ سرحد کے دورہ سے واپسی پر میں اس دورہ کے نتائج کے بارے میں وزیر اعظم کی خدمت میں رپورٹ پیش کروں گا۔

دستخط (کوثر نیازی)

۱۹۷۶-۱۲-۲۳

وزیر اعظم نے اس پر مجھے لکھا۔

مجھے یقین ہے یہ ایک نہایت کامیاب کام ہو گا۔

دستخط (وزیر اعظم)

وزیر برائے مذہبی امور (بالی نیلم)

اصل متن کیلئے ملاحظہ ہو ضمیر جات

مجھے وزیر اعظم نے جنوری ۱۹۷۷ء میں ہدایت دے دی تھی کہ میں بڑے بڑے جلسوں کا آغاز کروں۔ طریقہ کاریہ تجویز ہوا تھا کہ پہلے پاکستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں جلسے کر کے میں پی۔ این۔ اے کو جس حد تک ممکن ہو وفاقی پوزیشن پر لے آؤں اس کے بعد خود وزیر اعظم اس کے سیاسی قلعوں پر حملوں کا آغاز کریں۔ اگرچہ انتخابی مہم کے عمل انچارج رفیع رضا تھے۔ جو بلاشبہ مسز بھٹو کے لئے بے حد مخلص تھے اور انہیں صحیح مشورے دیتے تھے۔ وہ بے حد شریف انسان بھی تھے اور بھٹو صاحب کے کافی قریب بھی۔ بے حد ذہین تھے مگر غیر سیاسی آدمی ہونے کی وجہ سے ایک اعتبار سے بیورد کرینٹ بھی تھے۔ بڑے دیانت دار اور با اصول تھے لیکن سیاسی جھیلوں سے خود کو الگ رکھ کر ڈرائنگ روم سیاست تک محدود رکھتے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ کسی بھی حلقہ سے خود کھڑے نہ ہوئے تھے۔ میں نے اپنی خطابت کے ذریعے پی۔ این۔ اے کی انتخابی مہم جوئی کو پسپائی پر مجبور کر دیا اور ان کی بعض کمزوریوں پر ہاتھ رکھا تو عوام نے بھی دیکھا اور خود وزیر اعظم نے بھی کہ ایک طرف پی۔ این۔ اے کے فوٹو تھے اور دوسری جانب پیپلز پارٹی کی طرف سے میں اکیلا ان سے کہیں زیادہ بڑے جلسے کر کے انہیں میدان سے پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر رہا تھا اس طرح بھٹو صاحب کے لئے میدان میں اترنے کا راستہ ہموار ہوتا جا رہا تھا۔

ایک دفعہ پی۔ این۔ اے کے تضادات کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کی غرض سے میں نے ایک جلسہ عام میں چیلنج دیا کہ اگر یہ لوگ نظام مصطفیٰ کے نفاذ میں اتنے ہی مخلص ہیں اور ان کا اتحاد بھی خلوص نیت پر مبنی ہے تو مولانا شاہ احمد نورانی مفتی محمود کے پیچھے نماز ادا کر کے دکھائیں اور پھر اس کی قضا بھی ادا نہ کریں۔ اگر ایسا ہو گا تو میں پیپلز پارٹی کی طرف سے اعلان کرتا ہوں کہ ہم پی۔ این۔ اے کے امیدواروں کے مقابلے میں اپنے تمام امیدوار بٹھادیں گے۔

میرے اس چیلنج کا ہر دو جانب بڑا گہرا اثر مرتب ہوا پی۔ این۔ اے والے بھی جانتے تھے اور میں بھی کہ حضرت مولانا شاہ احمد نورانی کی گردن پر اگر تلوار بھی رکھ دی جائے تو وہ مفتی محمود کی امامت میں کبھی نماز نہیں پڑھیں گے۔ لیکن وزیر اعظم بھٹو کو چونکہ ان غلامی کے اختلافات سے آگہی ذرا کم تھی اس لئے وہ گھبرا گئے اور مجھے اس رات فون کر کے کہنے لگے کہ ”یہ تم نے کیا چیلنج کر دیا۔ تم ان لوگوں کو نہیں جانتے“ یہ لوگ ایسا کر گزریں گے ”پھر اسی شام ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ”کوثر نیازی نے ان لوگوں کو اپنے امیدواروں کو ڈرا کر لے کر چیلنج تو دے دیا ہے لیکن وہ نہیں جانتا کہ اگر ایکشن جیتنے کے لئے ان لوگوں کو مرزا غلام احمد قادیانی کی قبر پر بھی جانا پڑا تو یہ دریغ نہیں کریں گے“ میں نے بھٹو صاحب کو فون پر تسلی دی کہ وہ پریشان نہ ہوں ایسا کبھی نہ ہو گا ”میں ان کے مسلک اور مسائل سے اچھی طرح واقف ہوں پھر بھی مسز بھٹو کو اصرار رہا کہ میں ایسا چیلنج نہ دوں لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا اور اب عوام پی۔ این۔ اے کی جماعتوں کے دعویٰ اتحاد کو آزمانے پر تامل گئے تھے چنانچہ ملتان کے ابن قاسم

باغ میں جلسہ عام کے دوران مغرب کی نماز مولانا مفتی محمود نے مولانا شاہ احمد نورانی کی اقتدا میں ادا کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انہوں نے میرا چیلنج قبول کر لیا ہے۔ میں نے اسی شام ایک جلسے میں اپنا چیلنج دہرایا اور کہا کہ..... ”میں نے چیلنج یہ دیا تھا کہ شاہ احمد نورانی مفتی محمود کی امامت میں نماز ادا کریں یہ نہیں کما تھا کہ مفتی محمود شاہ احمد نورانی کی امامت میں نماز ادا کر کے دکھائیں“ اس پر پی۔ این۔ اے کو سانپ سونگھ گیا۔

اگلے روز لاہور ایئر پورٹ پر حضرت شاہ احمد نورانی سے اتفاقاً میری ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے مجھ سے مشفقانہ گلہ کیا اور بولے۔ ”تم نے ہماری دکھتی رنگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے“ انتخابی مہم اپنے پورے عروج پر تھی اور میں لوگوں کا جوش و خروش دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ پیپلز پارٹی بھاری اکثریت سے ایکشن جیت لے گی اگرچہ مجھے اس کا بھی علم تھا کہ بعض انتخابی نتائج میں امیدواروں کی فتح و شکست کا فیصلہ صرف چند سو یا چند ہزار ووٹوں کے فرق سے ہو گا۔ تاہم مجھے اس امر کا پورا یقین تھا کہ جیت پیپلز پارٹی ہی کی ہو گی۔

اس وقت تک مسز بھٹو کا ”آپریشن وکٹری“ نامی منصوبہ میرے علم میں نہ تھا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ وہ بسا اوقات کسی بھی ضلع کے ذہنی کمشنر اور ایس پی تک سے براہ راست معلومات حاصل کرتے تھے۔ لیکن مجھے اس کا کوئی علم نہ تھا کہ انتخابات میں رنگ (دھاندل) کا کوئی طے شدہ منصوبہ بھی راور شیدا اینڈ کمپنی وضع کر چکی تھی۔ یہ پس منظر کے لوگ تھے اور ہم پیش منظر میں سیاسی جنگ سیاسی طور طریقوں کے مطابق لڑ رہے تھے۔

انتخابات میں رنگ کا سب سے پہلا انکشاف مجھ پر ۷ مارچ کے دو ہی روز بعد اس وقت ہوا جب پی۔ این۔ اے نے اپنا ایجنڈا شروع کر چکی تھی ”اس نے انتخابی نتائج کو مسترد کر دیا تھا ایک شام پی۔ ایم باؤس میں وزیر اعظم بھٹو، میں، حفیظ پیرزادہ، رفیع رضا اور ایک دو اور احباب موجود تھے کہ وزیر اعظم نے پیرزادہ کی طرف دیکھا اور گویا ہوئے۔ ”حفیظ کتنی سیٹوں پر گزری ہوئی ہوگی؟“

”سر..... ۳۰ سے ۴۰ تک“ حفیظ نے مختصر جواب دیا۔

”کیا ہم پی۔ این۔ اے والوں سے یہ بات نہیں کر سکتے کہ وہ اتنی سیٹوں پر اپنے نمائندے کامیاب کر لیں ہم ضمنی انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے؟“

وزیر اعظم کی بات سن کر میرا کیا حال تھا؟ بس اتنا جان لیں کہ میں ان کے چہرے کی طرف دیکھتے کا دیکھتا ہی رہ گیا تھا اور اپنے آپ کو اچانک ہی بہت بے خبر اور احمق سا محسوس کرنے لگا تھا کیونکہ میں نے تو اپنی دانست میں پیپلز پارٹی کو بالکل صاف ستھرے انتخابات میں فتح دلانے کے لئے شبانہ روز محنت کی تھی۔ انتخابی مہم کے دوران اپنی تقاریر کے ذریعے وہ ”ہیمبو“ بنایا تھا جو ووٹرز کو پولنگ کے دن پیپلز پارٹی کے حق میں ووٹ ڈالنے کے لئے گھروں سے نکالنے کے لئے کافی تھا..... پھر یہ میں کیساں رہا تھا؟ کیا وزیر

اعظم جانتے تھے کہ انتخابات میں رنگ ہوگی۔ رنگ کرانی جارہی ہے۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اپنی ساری محنت کارا حاصل نظر آ رہی تھی۔

چوتھا باب

نجومیوں اور دست شناسوں سے مشورے



۷ جنوری ۱۹۷۷ء کو قومی اسمبلی میں وزیر اعظم بھٹو نے جب ۷ مارچ کے الیکشن کا اعلان کیا تو پیپلز پارٹی کی سیاسی حکمت عملی جس پر انہوں نے ہم سے مشورہ لیا تھا، یہ طے پائی کہ اپوزیشن کی تمام جماعتیں باہمی انتشار اور خلفشار کی شکار ہیں۔ ان میں اتنے تضادات ہیں کہ یہ جماعتیں شاید ہی انتخابی اتحاد قائم کر کے پیپلز پارٹی کے امیدواروں کے مقابل متفقہ امیدوار کھڑے کر سکیں۔ اس وقت تک بعض سیاسی جماعتوں کا ایک اتحاد ملک میں یو۔ ڈی۔ ایف کے نام سے موجود تھا جس میں جمعیت العلماء پاکستان اور تحریک استقلال شامل نہیں تھیں۔ جماعت اسلامی یو۔ ڈی۔ ایف کی سب سے قابل ذکر اور منظم جماعت تھی اور دوسری جماعت این۔ ڈی۔ ٹی تھی۔ جس کے سربراہ سردار شیرباز مزاری تھے۔ یہ درحقیقت انہی افراد پر مشتمل تھی جن کی سیاسی سرگرمیاں نیپے پر پابندی کے بعد تقریباً ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔ بہر حال شیرباز مزاری اور بیگم نسیم دلی خان اس کا اہم پارٹی کے تن مردہ میں روح پھونکنے کے لئے کوشاں رہے اور انہیں اپنے مقصد میں کامیابی بھی حاصل ہوئی۔

جونہی وزیر اعظم نے انتخابات کے پروگرام کا اعلان کیا، اپوزیشن کی صفوں میں حیرت انگیز سرگرمیاں دیکھنے میں آئیں۔ انجیلی بھٹو کی رپورٹوں کے مطابق ایک نیا سیاسی انتخابی اتحاد کسی بھی وقت وجود میں آنے والا تھا۔ یو۔ ڈی۔ ٹی، یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ میں شامل تو تھی لیکن جماعت اسلامی کے غلبہ کی وجہ سے اسے فرنٹ میں کوئی خاص حیثیت حاصل نہ تھی بلکہ اس کی سیاسی قربت ایڑ مارشل اصغر خان کی تحریک استقلال کے ساتھ زیادہ تھی۔ انتخابات کا اعلان ہوتے ہی سردار شیرباز مزاری اور پروفیسر غفور احمد ایبٹ آباد پہنچے اور انہوں نے اصغر خان سے ملاقات کی اور انہیں یو۔ ڈی۔ ایف میں شمولیت کی دعوت دی۔ اصغر خان نے ان کی دعوت کا جواب سرد مہری سے دیا کیونکہ وہ اس قسم کے سیاسی اتحاد کے پہلے ہی بہت سے ہوئے تھے پروفیسر غفور اور مزاری صاحب نے انہیں بہت اونچے سچے سمجھائی اور بتایا کہ پیپلز پارٹی کا مقابلہ کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ عوام کا اعتماد حاصل کیا جائے اور عوام کا اعتماد انتخابی اتحاد کے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال اس ملاقات کا نتیجہ اس حد تک نکلا کہ اصغر خان اور حضرت مولانا شاہ احمد نورانی نے ایک مرتبہ یو۔ ڈی۔ ایف کے تمام رہنماؤں کے ساتھ مل بیٹھنے پر آمادگی ظاہر کر

دی۔ جب اپوزیشن کے تمام سربراہوں کا اجلاس ہوا تو سیاسی یا انتخابی اتحاد سے نااں ہر دو حضرات نے کسی بھی انتخابی اتحاد میں شرکت کے لئے اپنی بے پلگ شرائط پیش کر دیں ان شرائط کا تعلق نہ تو سیاسی اتحاد کے منشور یا پروگرام سے تھا اور نہ ہی کسی اور نظریاتی وابستگی سے اس کا کوئی علاقہ تھا۔ بنیادی طور پر یہ شرائط نشستوں کی تقسیم سے متعلق تھیں اور دوسری شرط جو ہے۔ یو۔ پی نے پیش کی وہ یہ تھی کہ نئے سیاسی اتحاد کا جنرل سیکرٹری ان کا اپنا آدمی ہو گا۔ جماعت اسلامی برقیہت پر اتحاد کے قیام کی خواہاں تھی اور پھر جب ہے۔ یو۔ پی نے رفیق باجوہ کا نام نئے سیاسی اتحاد کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے پیش کیا تو جماعت اسلامی نے اس پر بخوشی صاف کر دیا۔ جماعت اسلامی نے پی۔ این۔ اے کی تشکیل میں سب سے نمایاں کردار ادا کیا تھا اور ہے۔ یو۔ پی سے اپنی پرانی محاسبت کو بھی دقیق طور پر فراموش کر دیا تھا۔ رفیق باجوہ جماعت اسلامی کے نزدیک شروع ہی سے ایک مشکوک کردار کے آدمی تھے۔ اور جماعت کو توقع تھی کہ ان سے کسی بھی وقت کوئی ایسی غلطی ہو سکتی ہے جسے ہانا بنا کر جماعت اسلامی پی۔ این۔ اے کی سیکرٹری شپ ہے۔ یو۔ پی سے چھین لے گی۔ چنانچہ جماعت اسلامی کی ”سیرت مردوس“ چوبیس گھنٹے مسٹر باجوہ کی نگرانی کرتی تھی۔ بعد کی اطلاعات کے مطابق راؤ زبیر اور محمد حیات ٹمن کے آدمی ہے۔ یو۔ پی میں بہت مؤثر مقامات پر موجود تھے اور پی۔ این۔ اے کی سیکرٹری شپ ہے۔ یو۔ پی کو دلانے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ ادر وزیر اعظم بھٹو کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ مخالف جماعتوں کے اتحاد کی جو بھی صورت بنے اصغر خان کوئی نمایاں عہدہ حاصل نہ کر سکیں۔ خصوصاً انیس پی۔ این۔ اے کی قیادت نہ سونپ دی جائے۔ مغربی تعلیم یافتہ اور روشن خیال اصغر خان، وزیر اعظم کے نزدیک ”مبادل قیادت“ کا سیاسی تصور پیدا کر سکتے تھے اور عوام کے لئے اپنے اندر خاصی کشش رکھتے تھے۔ ان کی اور راؤ رشید کے علاوہ ٹمن کی بھرپور کوشش یہ تھی کہ مولانا مفتی محمود کو پی۔ این۔ اے کا سربراہ بنوایا جائے جو مسٹر بھٹو کی پرکشش شخصیت کے مقابل با آسانی مار کھا جائیں گے چنانچہ اس سلسلے میں تمام انٹیلی جنس ایجنسیوں کو متحرک کر دیا گیا۔ مخالف سیاسی جماعتوں خصوصاً ہے۔ یو۔ پی اور جماعت اسلامی میں اپنے راہبوں کو استعمال کیا گیا۔ صحافیوں کو بھی خرید گیا یہاں میں اس راز سے پردہ اٹھانا نہیں چاہتا کہ کون کون کتنے ارزاں داموں بکا۔ بہر حال کوششیں رنگ لائیں اور اصغر خان کو پی۔ این۔ اے کی سربراہی نہ مل سکی۔ ان کی سربراہی کی راہ میں پہلا پتھر تو خود ان کی حلیف جماعت ہے۔ یو۔ پی سیکرٹری جنرل کا عہدہ لے کر بن گئی۔ اب باقی مہماتوں کو اعتراض کا موقع ملا کہ کیا دونوں مرکزی عہدے ہم یو۔ ڈی۔ ایف سے باہر کی جماعتوں ہی کو دے دیں یہ اور اس جیسے دوسرے بہت سے اعتراضات اصغر خان کی ذات کے حوالے سے پی۔ این۔ اے کی صفوں میں ہلکتے کر دیئے گئے۔ میں اس اندرون خانہ سیاسی جنگ سے آگاہ تھا اور میری رائے اس کے بالکل برعکس تھی میرا وزیر اعظم بھٹو کو یہ مشورہ تھا کہ اگر انہیں اپنے فخریہ ذرائع سے کچھ کرانا ہی ہے تو یہ کر انہیں کہ اپوزیشن کی جماعتیں انتخابی اتحاد قائم نہ کر سکیں

بلکہ علیحدہ علیحدہ اپنے امیدوار کھڑے کر کے پیپلز پارٹی کے امیدواروں کا مقابلہ کریں۔ لیکن مسٹر بھٹو اور ان کے مشیر برز عم خویش اتنے پر اعتماد تھے کہ انہیں اس طرح کے کسی اتحاد سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا ان کا خیال تھا کہ اگر اس طرح کے کسی اتحاد کی سربراہی اصغر خان کے ہاتھ میں نہ ہو تو پھر ایسا اتحاد کسی طور پر پیپلز پارٹی کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔

مولانا مفتی محمود مرحوم کو نو (۹) جماعتوں کے انتخابی اتحاد پی۔ این۔ اے کی سربراہی دلائی گئی۔ تو اس کامیابی کا باقاعدہ جشن بھی منایا گیا کہ آدھا انتخاب گویا جیت لیا گیا ہے۔ مسٹر بھٹو کو یقین دلایا گیا کہ اب جب لوگ مفتی محمود کے مقابل ان کی شخصیت کو رکھیں گے تو لا محالہ وزیر اعظم کی حیثیت میں مفتی محمود کا تصور کر کے ہی گھبراہٹیں گے۔ ان کا کوئی عالمی ایجن بھی نہیں ہے وزیر اعظم مطمئن تھے کہ اب پی۔ این۔ اے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی اور اس فوش فشی کے عالم میں ان سے انتخابی مہم کا سب سے بڑا ”بلنڈر“ سرزد ہوا کہ انہوں نے پی۔ این۔ اے کی نو جماعتوں کو ایک انتخابی نشان الیکشن کمیشن کی جانب سے الاٹ ہو جانے یا دروازہ جو اس کا حق رکھنے کے کہ نو جماعتیں جو آپس میں ضم نہیں ہوئی تھیں بلکہ اپنا علیحدہ تشخص رکھتی تھیں اور اس مسئلہ پر الیکشن کمیشن انہیں ایک انتخابی نشان الاٹ کرنے کے خلاف فیصلہ دے سکتا تھا۔ مسٹر بھٹو نے بحیثیت چیف ایگزیکٹو اپنے مخصوص اختیارات کے تحت نو جماعتوں کو ایک انتخابی نشان الاٹ کرنے کی اجازت دے دی۔ ”ہل“ کے انتخابی نشان کے سلسلے میں بھی وزیر اعظم کے قریبی مجیکر کریت کا مشورہ یہی تھا۔

کہ تلوار کے مقابل نشان عوامی جاہلیت سے بے کسر محروم ہے بلکہ مفتی محمود اور پی۔ این۔ اے کے دیگر سربراہوں کے ایجنڈے کے کام آئے گا۔ میرے نزدیک یہ پیپلز پارٹی کی سیاسی حکمت عملی کی سب سے بڑی غلطی تھی لیکن نثار خانے میں طوطی کی صدا کون سنتا؟ وہ لوگ آج انتخابات کے ماہر اور مسٹر بھٹو کے نفس ناخفہ بنے ہوئے تھے۔ جنہیں سیاسی عمل کی مہاریات سے بھی آگہی نہ تھی۔ ان کے تجربات ڈھاکہ اور بلوچستان میں قتل عام تک محدود تھے اور یا پھر پولیس ملازمت کے دوران اوپر والوں کی جوتیاں سیدھی کرنے اور عوام کو جوئے لگانے تک۔ پولیس کی ملازمت آدمی کو کچھ اور سکھاتی ہو یا نہ سکھاتی ہو، اپنے ”باس“ کو بہر جائز و ناجائز طریقے سے خوش کرنے اور اپنی ملازمت بچی کرنے کے آداب ضرور سکھا دیتی ہے۔ ”رانجھا رضی“ کرنے کے لئے اس سرورس کے بعض لوگ ہر حد سے آگے گزر جاتے ہیں۔ یہ اتنے ہنرمند ضرور ہوتے ہیں کہ اس کرتی کو جو اختیارات کا منبع و ماخذ ہو بڑی کامیابی کے ساتھ یہ یقین دلا سکیں کہ اس کی مضبوطی کا اصل ذریعہ اور سبب یہی لوگ ہیں۔ یہی کچھ مسٹر بھٹو کے ساتھ ہوا اور اب وہ بری طرح ان مشیران کرام کے نرغے میں آ گئے۔

جہاں تک مسٹر بھٹو کی اپنی ذات اور شخصیت کا تعلق ہے، وہ بے پناہ ذہین، حقیقت پسند اور روشن

خیال انسان تھے۔ وہ درحقیقت ایک بڑے انسان تھے اور ہر بڑے انسان کی طرح ان میں بھی چند کمزوریاں تھیں۔ انہیں وہ لوگ اچھے لگتے تھے جو خود کو ”شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار“ ثابت کرنے میں معروض رہتے۔ اس لئے یہ مشیر صاحبان ان کے پسندیدہ ترین افراد تھے ہی..... لیکن سندھ کے ایک صوبائی وزیر بھی، جنہیں پراسرار علوم خصوصاً نجوم اور دست شناسی کا بہت شوق تھا اس ناطے ان کے قریب آگئے تھے۔ سری لٹکا کے ایک بڑے دست شناس اور ستارہ شناس سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ وزیر اعظم نے جب ۱۹۷۷ء کو انتخابات کے انعقاد کی تاریخ قرار دیا تو یہ صاحب اس تاریخ کے سعد ہونے کی سند سری لٹکا کے ستارہ شناس سے لے کے آئے تھے خود مسٹر بھٹو بھی کسی نہ کسی حد تک اس قسم کے پراسرار علوم میں یقین رکھتے تھے۔ جب سری لٹکا کے نجومی نے ۱۹ مارچ کے باریک بینی کی تصدیق کر دی تو مسٹر بھٹو نے اپنے ہاتھ کے نشانات ایک درست ذریعے پاکستان کے معروف دست شناس ایم۔ اے۔ ملک صاحب کو بھجوائے۔ بلاشبہ ایم۔ اے۔ ملک اپنے فن میں یکتا ہیں اور اس علوم پر انہوں نے بڑی سائنسی بنیادوں پر محنت کی ہے۔ ایم۔ اے۔ ملک صاحب نے مسٹر بھٹو کے ہاتھوں کے نشانات دیکھ کر بہت کچھ سمجھ لیا تھا۔ لیکن ان کی فطرتی خوف سے انہوں نے اس دوست کو کوئی واضح بات نہ بتائی بعد ازاں جن دنوں مسٹر بھٹو کوٹ کھپت جیل میں تھے اور ان پر احمد رضا قصوری کے والد کے قتل کی سازش میں شریک ہونے کے الزام میں مقدمہ زیر سماعت تھا تو ایم۔ اے۔ ملک صاحب نے مجھے ان کے ہاتھوں کے یہ نشانات دکھائے تھے انہوں نے ایک خاص لائن پر انگلی رکھی ”وہاں لکیر کے اختتام پر ایک لکیر گر رہی تھی۔ جس پر گول دائرہ تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا..... ”آپ ان لکیر کو دیکھ کر کس نتیجے پر پہنچے ہیں“ میں خاموش رہ گیا۔..... پھر وہ خود ہی بولے..... ”اس آدمی کا دماغ اسے پچھانی کے تختے تک پہنچائے گا“ مسٹر ملک کی بات سونی صد درست تھی، نئے وقت نے بعد ازاں ثابت بھی کر دیا۔ میں خود بھی ہاتھ کے پرنٹ دیکھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا۔

وزیر اعظم جب سری لٹکا کے دورے پر گئے تو انہوں نے مسز بندرا ٹائیپکے سے خواہش ظاہر کی کہ وہ ان کے درباری نجومیوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ مسز بندرا ٹائیپکے نے اس کا اہتمام کر دیا۔ وزیر اعظم بھٹو نے نجومیوں کو ۱۹ مارچ کی تاریخ سے آگاہ کیا، اور انہیں حساب لگانے کو کہا..... کہ اس تاریخ کو ہونے والے انتخابات کا نتیجہ کیا نکلے گا۔..... لیکن ایک بھی نجومی نے ان کی بات کا جواب نہ دیا۔ سب کے ہونٹوں پر گویا مرگ گئی تھی مسز بھٹو کے بے حد اصرار پر سب سے بزرگ نجومی نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا..... ”اب تو آپ تاریخ کا اعلان کر چکے ہیں ہم اس میں کیا رائے دے سکتے ہیں؟“

انتخابی مہم کا آغاز

اس سارے پس منظر میں ۱۹ مارچ ۱۹۷۷ء کو پاکستان کے عوام عام انتخابات کے لئے اپنے ووٹ کا استعمال کرنے والے تھے۔ مجھے بھٹو صاحب کی ایک شدید خواہش کا علم تھا۔ جس کا اظہار انہوں نے بیشتر مواقع پر میرے سامنے کیا تھا اور وہ یہ کہ..... وہ انتخابات میں دو تہائی اکثریت سے کامیابی چاہتے تھے۔ وہ آئین میں تبدیلی کے لئے دو تہائی اکثریت سے جیتنے کے خواہش مند تھے۔ ممکن ہے ہی۔ این۔ اے کے جلسوں اور جلوسوں کی رپورٹوں سے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہوں یا مشیران کرام نے انہیں یہ باور کرایا ہو کہ دو تہائی اکثریت حاصل نہ ہو سکے گی۔ اس لئے ہمیں اپنے ”جوہر دکھانے“ کے مواقع دیئے جائیں۔ صورت حال یہ تھی کہ قومی اسمبلی کے لئے کل ۲۰۰ نشستیں تھیں۔ پیپلز پارٹی نے تمام نشستوں پر اپنے امیدوار کھڑے کئے تھے۔ ۹ نشستوں پر پیپلز پارٹی کے امیدوار بلا مقابلہ کامیاب ہو چکے تھے۔ ان میں سے سندھ میں ۱۵ اور بلوچستان میں ۴ نشستوں پر بلا مقابلہ کامیابی کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ قبائلی علاقے سے ۸ نشستیں بھی جیتنے والی پارٹی کو مل جائیں جن نشستوں پر مقابلہ تھا، ان میں بلوچستان سے ۳، پنجاب سے ۱۱۵، سرحد سے ۲۶ اور سندھ سے ۲۸ نشستیں تھیں سادہ اکثریت حاصل کرنے کے لئے ۱۰۵ سینیٹس جیتنا تھیں لیکن دو تہائی اکثریت حاصل کرنے کے لئے بقیہ ۱۷۲ میں سے ۱۰۵ سینیٹس حاصل کرنا ضروری تھیں۔ قومی اتحاد نے بلوچستان سے کسی نشست پر مقابلہ نہیں کیا تھا۔ باقی تین صوبوں سے اسے سادہ اکثریت کے لئے ۱۰۱ اور دو تہائی اکثریت کے لئے ۱۳۲ سینیٹس حاصل کرنا تھیں۔ جو ویسے ہی بہت مشکل نظر آتا تھا۔ کیونکہ پی۔ این۔ اے فقط ۶۹ نشستوں پر انتخابات لڑ رہا تھا۔ ان حالات میں پیپلز پارٹی کے لئے دو تہائی اکثریت حاصل کرنا اتنا بڑا اور مشکل کام نہ تھا، کئی سینیٹس ایسی بھی تھیں جہاں سے پی۔ این۔ اے کا ایک ہی امیدوار کھڑا ہوا تھا اور اگر وہ تمام نشستیں بھی جیت لیا جاتا تو بھی ایک کے سوا باقی نشستیں چھوڑنا پڑتیں اور ان میں سے کئی ضمنی انتخابات میں اس کے ہاتھ سے نکل سکتی تھیں۔ پی۔ این۔ اے میں شریک نو جماعتوں میں سے مسلم لیگ کو ۳۶ ٹکٹ لے تھے، جبکہ تحریک استقلال کو ۳۰، جماعت اسلامی کو ۳۱، جمعیت العلماء پاکستان کو ۲۳، جمعیت العلماء اسلام کو ۲۳، پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی کو ۱۳، عساکر تحریک کو ۲ اور مسلم کانفرنس کو کوئی ٹکٹ نہ ملا تھا، اس طرح کل ۱۶۹

نشستوں پر پی۔ این۔ اے مقابلہ کر رہی تھی۔ اگر انتخابات میں خدا نخواستہ پی۔ این۔ اے سادہ اکثریت حاصل کر کے حکومت بنا بھی لیتی تو، ہم دست و گریباں ان تمام پارٹیوں کی حکومت ۳ ماہ سے زیادہ نہ نکال سکتی تھی۔ اول تو ان جماعتوں کے لئے سادہ اکثریت کا حصول بھی ناممکن تھا کیونکہ انتخابی مہم کے عین نقطہ عروج پر پی۔ این۔ اے کی جانب سے بعض ایسے بیانات اور اقدامات سامنے آئے کہ ان کی پوری انتخابی مہم سبوتاژ ہو کر رہ گئی۔

مثال کے طور پر خواتین کے بارے میں رفیق باجوہ جنرل سیکرٹری پی۔ این۔ اے کے بعض بیانات نے خواتین کے ووٹ مکمل طور پر پی۔ این۔ اے کے ہاتھ سے نکال دیئے تھے۔

ایک ایسی صورت حال میں 'میں نہیں سمجھتا کہ انتخابات میں کسی قسم کی دھاندلی کی ضرورت باقی رہ جاتی تھی۔ لیکن بد قسمتی سے خشت اول کج تو خود وزیر اعظم بھٹو نے بلا متبادل منتخب ہو کر رکھ دی تھی۔ جس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ ان کی شان تو یہ تھی کہ وہ باقاعدہ الیکشن لڑ کر قومی اتحاد کے امیدوار مولانا جان محمد عباسی کی ضمانت ضبط کرادیتے۔ مولانا جان محمد عباسی لاکھ محبت الوطن اور مستقل مزاج رہنما تھے لیکن وہ کسی صورت بھی وزیر اعظم بھٹو کی برول عزیزی کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ صرف چند سو ووٹ حاصل کرتے اور ضمانت ضبط کرالیتے' جبکہ ان کے

مقابلے میں ذوالفقار علی بھٹو ایسا عالمی شہرت یافتہ سیاستدان نہیں، شاہ محمد پاشا آٹھوڑے تھے۔ ایسے بے ضرر امیدوار کو اغوا کرانا اور کاغذات نامزدگی داخل کرنے کے وقت تک پولیس کسٹڈی میں رکھوانا بیورو کریسی کا وہ کارنامہ تھا، جس نے وزیر اعظم بھٹو کی انتخابی دیانت اور انتخابات کے فیئر ہونے کے تصور کو بُری طرح مجروح کیا۔ پیپلز پارٹی کی جانب سے سب سے پہلے بلا مقابلہ کامیاب امیدوار لاڑکانہ کے حاتمہ ۱۶۳۔ سلطان احمد چانڈیو تھے۔ یہ گویا نمونے کی کاروائی تھی۔

جو سسر محمد خان جو نیچو ہوم سیکرٹری سندھ اور مسٹر خالد ملک ڈپٹی کمشنر لاڑکانہ نے اپنی اعلیٰ کارکردگی سے مسٹر بھٹو کو خوش کرنے کے لئے ان کے سامنے پیش کی تھی اور انہیں بتایا تھا کہ کس قدر آسانی سے الیکشن جیت کر ان کی جھولی میں ڈالا جاسکتا ہے۔ ۱۹ جنوری کو قومی اسمبلی کے کاغذات نامزدگی داخل کرنے کی آخری تاریخ تھی۔ اس روز شام کو وزیر اعظم بھٹو اور پارٹی کے چند اراکین کے بلا مقابلہ منتخب ہونے کی خبر ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر کر دی گئی اور اگلے روز کے تمام اخبارات نے مسٹر بھٹو کی ایک ہی تصویر ایک ہی سائز میں تین کالمی ۱۹ ایک ہی کپشن اور ایک ہی جیسی خبر کے ساتھ شائع کی۔ مولانا جان محمد عباسی کو بعض اہل علم کے اطلاعات کے مطابق ۱۸ جنوری کی شام ہی پولیس نے اپنی حراست میں لے لیا تھا اور کاغذات نامزدگی جمع کرانے کا وقت ختم ہونے کے بعد اگلے روز انہیں رہا کیا گیا ان کے بیانات کو پی۔ این۔ اے نے اپنی انتخابی مہم کی بنیاد بنا لیا اور یوں ابتداء ہی میں بیورو کریسی نے پارٹی کی انتخابی مہم کو ناقابل بیان حد تک نقصان پہنچایا۔ پینے ہی مرحلے میں بلا مقابلہ کامیاب ہونے والے ۱۹ امیدواروں میں سے سندھ کے ۱۵

امیدوار یہ تھے۔

نور محمد لنڈ، سکھرم، میر مران خان، بجرانی، جیکب آباد، عبدالفتح حسین نواب شاہ، غلام مجتبیٰ خان جتوئی نواب شاہ، بشیر احمد شاہ، نواب شاہ، ذوالفقار علی بھٹو لاڑکانہ، سلطان احمد چانڈیو لاڑکانہ، ممتاز علی بھٹو لاڑکانہ، مخدوم محمد زمان طالب، مولوی حیدر آباد، حاجی نجم الدین لغاری، بدین، نیاز محمد وسان تھریار کر، ملک سکندر خان، داؤد، آئن خان لغاری، داؤد، لیاقت علی جتوئی، داؤد، عطا محمد مری ساگھڑ، بلوچستان سے جو ۳ امیدوار بلا مقابلہ کامیاب قرار پائے ان میں تاج محمد جمالی، سیدی عبدالنہی بھٹائی، سیدی، پرنس محی الدین قلات، اور امان اللہ لکھی، قلات ۲ شامل تھے۔

مذکورہ بالا ۱۹ کامیاب امیدواروں میں سے صرف دو چار اصحاب کے بارے میں یقین سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ واقعی بلا مقابلہ منتخب ہو سکتے تھے۔ ان میں سے ایک تو مسٹر غلام مجتبیٰ خان جتوئی تھے اور دوسرے مخدوم محمد زمان طالب مولوی۔ باقی تمام بلا مقابلہ کامیابیاں پرائم منسٹر سیکرٹریٹ کے خصوصی انتخابی سیل کے انتظامی سربراہ مسٹرن اور سیاسی معاملات کے انچارج مسٹراؤ عبدالموئید کے حسن کرشمہ ساز کی کار فرمایاں تھیں۔

بلا مقابلہ انتخاب کی یہ روایت صوبائی اسمبلی کے لئے کاغذات نامزدگی داخل کرانے والے چاروں صوبائی وزرا اعلیٰ نے بھی نبھائی اور بلا شرکت غیرے لیڈر نظر آنے کی کوشش میں رسوائی کی رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ حالانکہ سوائے غلام مصطفیٰ جتوئی اور نواب ریسانی کے کوئی بھی اس قابل نہ تھا کہ بلا مقابلہ تو کیا انتخاب میں حصہ لے کر ویسے بھی جیت سکتا۔ جس کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ جب نصر اللہ خٹک کا قومی اسمبلی کے لئے بلا مقابلہ انتخاب الیکشن کمیشن نے کاغذات نامزدگی یا تو بعد میں وہ مولانا عبدالحق کے مقابلے میں پشاور سے بری طرح شکست کھا گئے۔

انتخابی مہم کے لئے ملک میں نائز دغدغہ ۱۱۳۳ اٹھائی گئی تھی تاہم ہنگامی حالت و فیض آف پاکستان روز سمیت برقرار رکھی گئی تھی۔ "جمہور" کے ذریعے انتخابات جیتنے کا عمل مظاہرہ ۱۹۷۵ء کے موسم گرما میں آزاد کشمیر میں ہونے والے انتخابات میں بڑی کامیابیاں سے کر کے بعض لوگ وزیر اعظم کے منظور نظر بن چکے تھے۔ سردار عبدالقیوم اور مسلم کانفرنس کو شکست دینے کے لئے انہوں نے انتخابی عمل کے نگران کی حیثیت سے اپنی آہن گرفت کا جو شاندار مظاہرہ کیا تھا اس کے بعد وہ مسٹر بھٹو کے لئے ناگزیر بن چکے تھے۔ ان کے درمیان گویا ایک دوسرے سے بڑھ کر خود کو جمہور کا باہر ثابت کرنے کی دوڑ لگی ہوئی تھی۔ اگرچہ رفیع رضوانے انتخابی مہم کے انچارج کی حیثیت سے ان کی بیشتر انتخابی معھکہ خیز تجاویز کو بڑی جرأت مندی کے ساتھ رد کیا، لیکن بعض معاملات میں وہ شریف انسان بھی بے حد بے بس نظر آتا مگر ان مشیروں پر سب سے برا وقت اس وقت آیا، جب ملک سے دغدغہ ۱۱۳۳ ہٹنے ہی پی۔ این۔ اے کے جلسوں اور

جلوسوں کا گویا ایک سیلاب سا منڈ آیا۔ فروری ۱۹۷۷ء میں جب انتخابی مہم زوروں پہنچی اس وقت ان کی بوکھلاہٹیں قابل دید تھیں۔ ان تمام خوش فہم لوگوں کا خاتمہ ہو چکا تھا، جو انہوں نے وزیر اعظم کے گرد تار عنکبوت کی صورت قائم کی تھیں۔ بلا مقابلہ انتخاب جیتنے کے ذریعے جو ڈرامہ ان لوگوں نے شروع میں رچایا تھا اس کے تاروں پر دبکھ چکے تھے۔ یہ وقت تھا جب وزیر اعظم کو پوری شدت سے اس امر کا احساس ہوا کہ انہیں اپنے نام نہاد مشیروں پر انحصار کم کر کے سیاسی میدان میں ہنی۔ این۔ اے کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ پیپلز پارٹی کی صفوں میں خود ان کے علاوہ دو چار ہی مقرر ایسے تھے جو ہنی۔ این۔ اے کے نو دس رہنماؤں کی جویشیلی اور جذباتی تقریروں کے سیلاب میں بہنے والے عوام کے بڑے بڑے اجتماعات کے سامنے مزاحمت کی دیوار کھڑی کر سکتے تھے۔ اس وقت مسز بھٹو نے مجھے حکم دیا کہ میں پورے ملک میں پیپلز پارٹی کے زیر اہتمام جلسہ ہائے عام سے خطاب کروں لہذا اس وقت بھی راؤ عبدالرشید وزیر اعظم کو اس قسم کے نوٹ بھجوا رہے تھے کہ سوائے وزیر اعظم کے اور کسی کو بڑے جلسوں سے خطاب نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس طرح وزیر اعظم کی طلسماتی شخصیت کا بیج مجروح ہوتا ہے، لیکن وزیر اعظم بھٹو نے گویا اس وقت انہیں ان کے ”اصل فرائض“ تک محدود کر کے سیاسی میدان سے خارج کر دیا تھا۔ وزیر اعظم کو اس سلسلے میں مجھ سے بہت زیادہ توقعات تھیں اور خدا کا شکر ہے کہ میں نے ہنی۔ این۔ اے کے تمام رہنماؤں کا مقابلہ خود انہیں کے ”ہتھیاروں“ کو لے کر انہیں پسپائی پر مجبور کر دیا ۲۸ جنوری کو میں نے سرگودھا میں پارٹی کی انتخابی مہم کے ایک بڑے جلسے سے خطاب کر کے پارٹی کمپین کا آغاز کیا اور اس سلسلے میں ایک باقاعدہ نوٹ کے ذریعے وزیر اعظم کو اپنے شیڈول سے آگاہ کیا۔

اس نوٹ کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔



یادداشت برائے وزیر اعظم

میں وزیر اعظم کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ میں پنجاب میں پارٹی کی انتخابی مہم کے سلسلے میں ۲۸ جنوری کو سرگودھا میں پہلے جلسہ عام سے خطاب کر رہا ہوں۔ مجھے پنجاب پارٹی کے کارکنوں اور پارٹی کے مقامی دفاتر کی طرف سے خطوط، تاروں اور نوٹوں کی صورت میں ایسی درخواستیں متواتر موصول ہو رہی ہیں کہ میں ان کے علاقوں میں جلسوں سے خطاب کروں۔ میں یہ درخواستیں براہ راست قبول نہیں کر رہا ہوں اس کے بجائے میں نے وزیر اعلیٰ سے کہا ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق مقامی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے میرے لئے پروگرام بنائیں جس پر عمل کروں تاہم اگر وزیر اعلیٰ میرے دورہ کا پروگرام نہ بنائیں تو پھر میں اپنا پروگرام خود بناؤں گا جس میں موصول درخواستوں کے مطابق ہر علاقہ کو برابری کی سطح پر حصہ دینے کی کوشش کی جائے گی۔ میں جن جلسوں سے خطاب کرنا چاہتا ہوں ان کے بارے میں وزیر اعظم کو سر حال مطلع کروں گا۔

سندھ کیلئے وزیر اعلیٰ کے مشورہ سے تیار کردہ جلسہ ہائے عام کا پروگرام درج ذیل ہے۔

۳ فروری	جیکب لائنز، کراچی
۵ فروری	حیدر آباد
۶ فروری	لانڈھی اور گورنگی (کراچی)
۱۸ فروری	علاقہ بلدیہ کراچی
۱۹ فروری	سکھر
۲۰ فروری	کراچی
۲۵ فروری	اورنگی کراچی

مجھے توقع ہے کہ وزیر اعظم اس پروگرام کو منظور فرمائیں گے۔

جہاں تک صوبہ سرحد کا تعلق ہے۔ میں پہلے ہی اس صوبہ کے بیشتر علاقہ کے دورہ کے دوران ملاکنڈ، سوات، ایبٹ آباد، ہری پور، نائسہ، کوٹاہ اور بنوں میں عام جلسوں سے خطاب کر چکا ہوں۔ مجھے ابھی پشاور اور مردان جانا ہے اور مجھے امید ہے کہ وہاں وزیر اعلیٰ کے مشورہ سے عوامی اجتماعات سے خطاب کروں گا۔ میرا ان سے رابطہ قائم ہے اور میں ان سے کہہ چکا ہوں کہ جب بھی میری ضرورت ہو وہ مجھے اس سے مطلع کریں۔

وزیراعظم کو یہ بتاتے ہوئے مجھے حسرت محسوس ہوتی ہے کہ صوبہ سرحد کے علماء سے میری ملاقاتیں حمایت کامیاب رہی ہیں۔ صوبائی حکومت کی طرف سے موصول ہونے والی رپورٹوں کے مطابق علماء سے میرے بے تکلفانہ اور آزادانہ تبادلہ خیال کے بعد ان کے بے بنیاد شکوک و شبہات دور کرنے میں بہت مدد ملی ہے اور ان کی سوجناؤرو یہ میں واضح تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔

دوسرے مقامات سے موصول ہونے والی دعوتوں کے طوفان میں میں اپنے حلقہ انتخاب کو فراموش نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ وہاں مجھے باقاعدہ جنگ لڑنی ہوگی، لیکن انشاء اللہ وہاں فتح ہماری پارٹی کی ہوگی۔ میں اپنے حلقہ میں آٹھ 'نودن گزارنے کی تجویز پیش کرتا ہوں، لیکن میں یہ عرصہ ایک ساتھ نہیں بلکہ ایک ایک 'دو 'دو دن کر کے وہاں گزاروں گا۔ اس کے علاوہ میرا باقی ماندہ وقت وزیراعظم کیلئے وقف ہو گا۔ وہ جہاں چاہیں گے میں وہاں جاؤں گا۔

برائے اطلاع پیش خدمت ہے

دستخط (کوثر نیازی)
۲۰۰۱-۰۶

وزیراعظم نے اس پر لکھا۔

جاری رکھیں، میں آپ کی کامیابی کا متنبی ہوں۔

دستخط (وزیراعظم)

وزیر برائے مذہبی امور

شینڈول کے مطابق ۳۱ جنوری کو میں نے سیالکوٹ میں ایک بڑا جلسہ عام کر کے پی این۔ اے کے تضادات سے بھرپور پروپیگنڈہ کے قلعہ پر بھرپور وار کیا۔ یکم فروری کو پھر سیالکوٹ ہی میں، میں نے تقریر کی، ۲ فروری کو میں صوبہ سرحد پتھانوں اور مانسہرہ کے مقام پر ایک بڑے جلسے سے خطاب کیا۔ ۳ فروری کو جیکب لائنز کراچی میں اور ۵ فروری کو حیدرآباد میں ایک تاریخی جلسے سے خطاب کیا۔ ۶ فروری کو میں واپس کراچی آیا اور جماعت اسلامی کے مضبوط ترین گڑھ پر حملہ کیا۔ ۱۲ فروری کو پنجاب میں گوجرانوالہ میں، میں نے ایک عظیم الشان جلسے سے خطاب کیا۔ ۱۸ فروری کو میں پھر سندھ پتھانوں کراچی میں جلسہ کیا۔ ۱۹ فروری کو سکھر میں ۲۰ فروری کو پھر کراچی میں اور ۲۵ فروری کو بھی کراچی میں ہی ایک دوسرے حلقے اورنگی میں جلسہ عام کیا۔ وزیراعظم نے بطور خاص میرے جلسوں کا پروگرام کچھ اس طرح ترتیب دیا تھا کہ جس شہر میں میں پہنچنے والے ہوں اس کے آگے بڑھتا تھا، اسی میں میرے بعد وزیراعظم بھٹو اس سے کہیں زیادہ بڑے جلسے سے خطاب کرتے تھے۔ مجھے اب اس سلسلے میں تمام تاریخیں اور مقامات تو یاد نہیں رہے تاہم اتنا مجھے یاد ہے کہ میرے ہر جلسے کی رپورٹ وزیراعظم اسی شام مختلف ایجنسیوں سے طلب کر کے مجھے فون پر مبارک باد دیتے۔

ہم نے پے درپے جلسے کر کے نہ صرف پی۔ این۔ اے کی جماعتوں کے تضادات واضح کئے بلکہ انہیں دفاعی پوزیشن پر تھیسٹ کر لے گئے ان تمام جلسوں میں، بھٹو صاحب کی تقریر کے خاص نکات پیپلز پارٹی کی حکومت کے وہ اقدامات ہوتے تھے جو میری وزارت کے تحت اسلام کی ترویج و اشاعت اور نفاذ کے ضمن میں کئے جاتے رہے تھے۔ کسی بھی جلسے میں بھٹو صاحب نے سوشلزم کا نام تک نہ لیا تھا بلکہ سرکاری طور پر بھی پارٹی کا نعرہ ”سوشلزم ہماری معیشت ہے“ ”ساوات محمدی ہماری معیشت ہے“ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔



جرنیلوں سے مشورے

انتخابات کے نتائج سات مارچ ۱۹۷۷ء کی رات تقریباً آٹھ بجے ریڈیو اور ٹیلیویشن سے نشر ہونا شروع ہوئے۔ میں سارا دن اپنے طبقہ انتخاب پر شور میں مصروف رہا تھا۔ میرے مقابل پی۔ این۔ اے کے حریف امیدوار ایک مقامی وکیل تھے۔ اپنے انتخابی جلسوں میں عوام کا جوش و خروش دیکھ کر اپنی کامیابی سے متعلق میرے ذہن میں کوئی شک نہ تھا۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن پر سب سے پہلا انتخابی نتیجہ اسلام آباد کے حلقہ نمبر ۳۵ سے پیپلز پارٹی کے امیدوار راجہ ظہور احمد کی کامیابی کا نشر ہوا۔ جن کا مقابلہ پی۔ این۔ اے کے امیدوار پروفیسر غفور احمد سے تھا۔ خود میرے حلقہ انتخاب این۔ اے۔ ۱۰۷ کا نتیجہ ۸ مارچ کی صبح تقریباً تین ساڑھے تین بجے نشر ہوا۔ کامیابی کی اطلاع پاتے ہی میں اسلام آباد روانہ ہو گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ ایک دو روز بعد دوبارہ اپنے حلقہ انتخاب میں آکر اپنے ووٹروں کا شکریہ ادا کروں گا۔ ۱۰ مارچ کو صوبائی اسمبلی کے انتخابات ہونا تھے۔ میں اسلام آباد پہنچا تو چند حلقوں کے سوائے بیشتر نتائج آچکے تھے اور پیپلز پارٹی نے دو تہائی اکثریت حاصل کر لی تھی۔ اسی شام پی۔ این۔ اے نے انتخابی نتائج کو دھاندلیوں کا شاہکار اور فراڈ قرار دے کر مسترد کر دیا۔ پی۔ این۔ اے نے اپنے کامیاب ہونے والے ۳۶ امیدواروں سے بھی کہا تھا کہ وہ قومی اسمبلی کی اپنی نشستوں سے استعفیٰ دیں۔ این۔ اے کے سربراہ مولانا مفتی محمود کے حوالے کر دیں پی۔ این۔ اے نے ۱۰ مارچ کے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے بائیکاٹ کا بھی اعلان کر دیا تھا اور ۱۳ مارچ سے انتخابات میں دھاندلیوں کے خلاف ملک گیر تحریک چلانے کا اعلان کیا تھا۔ پی۔ این۔ اے دوبارہ فوج کی مگرانی میں انتخابات کے انعقاد اور وزیراعظم بھٹو سے فوری طور پر مستعفی ہونے کا مطالبہ کر رہی تھی۔

انتخابات کے حیران کن نتائج سے قطع نظر یہ صورت حال میرے لئے بے حد تشویش ناک تھی۔ عالمی پریس خصوصاً بی بی سی، پی۔ این۔ اے کے نقطہ نظر کو شرح و بسط کے ساتھ پوری دنیا کے سامنے لارہا تھا۔ ۱۰ مارچ کو صوبائی اسمبلی کے انتخابات نے پی۔ این۔ اے کی عوامی طاقت کو پوری طرح ثابت کر دیا جب ملک بھر کے پوائنٹ بوتھ دیران پڑے تھے اور صرف پیپلز

پارٹی کے امیدوار میدان میں رہ گئے تھے۔ صوبائی انتخابات کا بائیکاٹ اس درجہ مکمل تھا کہ مجھے یہ شک ہونے لگا کہ پی۔ این۔ اے نے انتخابی نتائج کے خلاف ۱۳ مارچ سے جو تحریک چلانے کی دھمکی دی ہے وہ رازیاں نہیں جائے گی۔ ۱۱ مارچ کو پی۔ این۔ اے نے ملک بھر میں ہڑتال کی اپیل کی اور بلاشبہ ملک کے بیشتر شہروں خصوصاً کراچی میں عوام نے پی۔ این۔ اے کی اپیل کا مثبت جواب دیا۔ ۱۳ مارچ کو احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور صبح بھر کی سڑکیں آسٹریلیا، لائسنس چارج، ہائے ہائے کے نعروں سے گونجنے لگیں۔ ۱۸ مارچ کو قومی اتحاد کے کئی اہم رہنما جن میں اصغر خان، شاہ احمد نورانی، شیراز مزاری وغیرہ شامل تھے گرفتار کر لئے گئے۔ پی۔ این۔ اے اپنی مختلف ایلیوں کا عوام کی جانب سے مثبت جواب پا کر خاصا اعتماد حاصل کر چکی تھی۔ اگرچہ گرفتاریوں کی خبریں اخبارات میں کم ہی آتی تھیں، سیکنڈ خصوصاً کراچی آتش فشاں بن چکا تھا۔ ہنگامے اس قدر بڑھے کہ کراچی کے بعض علاقوں میں کرنیوٹا نذر کرنا پڑا۔ پولیس کی مدد کے لئے ایف۔ ایس۔ ایف اور فوج کے دستے طلب کر لئے گئے تھے۔ نئی کراچی، لیاقت آباد، ناظم آباد اور فیڈرل بی ایریا کے علاقوں میں فوج نے مکمل کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ اس کے باوجود پٹھان کالونی میں ایک نہایت ہولناک سانحہ نے جنم لیا جب عوام کے مشتعل ہجوم نے پیپلز پارٹی کی وارڈ کمیٹی کے صدر حبیب الرحمن کے گھر کو آگ لگا دی اور ۱۳ افراد کو زندہ جلا دیا۔ گھر کے اندر سے ہونے والی فائرنگ کے نتیجے میں ۳ حملہ آوروں کی ہلاکت کی بھی اطلاعات ملیں۔ پیپلز پارٹی کے دفاتر کو آگ لگانی جاری تھی اور اس کے ساتھ سرکاری اور نجی الماک بھی نشانہ بن رہی تھیں۔ سب سے ہولناک مالی نقصان ری پبلک موزز کی آگ سے ہوا۔ جس کے نتیجے میں ۲۵ کروڑ روپے کا سامان اور گاڑیاں نذر آتش ہوئیں۔ کراچی سے بھڑکنے والی یہ آگ رفتہ رفتہ پورے ملک میں پھیل گئی اور تمام نمایاں قائدین کی گرفتاری کے بعد تحریک پوری طرح عوام کے ہاتھ میں چلی گئی۔ مساجد نے تحریک کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا اور لاہور کی مسجد شہداء نے اس سلسلے میں عالمی شہرت حاصل کی۔ اول، دوم، اور سوم صف کے تمام قائدین کی گرفتاری کے بعد مساجد کے ائمہ حضرات نے عملاً حکومت کے خلاف تحریک کی قیادت سنبھال لی تھی اور انتخابی دھاندلیوں کے خلاف شروع ہونے والی تحریک اب ”نظام مصطفیٰ کے نفاذ“ کی تحریک میں تبدیل ہو چکی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت کے خلاف ایچ ایچ ایم کونٹنام مصطفیٰ کے نفاذ کی تحریک میں تبدیل کرنے میں مرکزی کردار جمعیت العلمائے پاکستان نے ادا کیا۔ ۲۱ مارچ کو پاکستان انٹیلیجنس کمیشن نے سرکاری طور پر انتخابی نتائج کا اعلان کر دیا۔ نو منتخب قومی اسمبلی کا پہلا اجلاس ۲۶ مارچ کو طلب کر دیا گیا تھا۔ جس میں اراکین کو حلف اٹھانا تھا اور آئندہ پانچ سال کے لئے حکومت تشکیل دینے تھی۔ اور قومی اتحاد، ۲۶ مارچ سے پہلے احتجاجی تحریک کو مزید سنگین اور شدید کرنا چاہتا تھا اور مولانا شاہ احمد نورانی نے کراچی میں ایک پریس کانفرنس کے ذریعے دھمکی دے دی تھی کہ ۲۶ مارچ کو قومی اسمبلی کے ”غیر آئینی اور غیر قانونی“ اجلاس میں شرکت کے لئے اراکان اسمبلی اپنی ذمہ داری پر

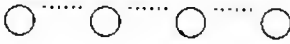
جائیں۔ تین چار ہفتے کی تحریک میں تقریباً ۲۵ کروڑ روپے کی املاک تباہ و برباد کی جا چکی تھیں۔ ادھر قومی اتحاد کے ایک اہم رہنما ایمر مارشل اصغر خان نے مسلح افواج کے سربراہوں کو ایک خط لکھا جس میں انہیں بھٹو حکومت کے خلاف بغاوت کی ترغیب دی گئی تھی اور بی بی سی کے مطابق اس خط کی تین ہزار کاپیاں دیگر فوجی افسروں میں بھی تقسیم کرائی گئی تھیں۔

وزیر اعظم وسط مارچ میں ہی فوج کے اعلیٰ افسران کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی میٹنگیں شروع کر چکے تھے۔ ابتدا میں وہ خود ہی مسلح افواج کے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے مختلف جرنیلوں سے ملاقاتیں کرتے رہے جن میں انہوں نے اپنی حکومت کی بھلا اور قومی اتحاد کے ریکی ٹیشن کو کچلنے کے سلسلے میں فوج کی مدد حاصل کرنے کے امکانات کا جائزہ لیا۔ جوں جوں ایچی ٹیشن بڑھتا گیا، سرورسز چیفس اور کور کمانڈرز کے ساتھ وزیر اعظم کی ملاقاتیں بھی بڑھتی گئیں۔ ان ملاقاتوں کے دوران جہاں مسٹر بھٹو جرنیلوں کو کرید کرید کر ان کے خیالات اور سوچوں سے خود کو آگاہ رکھنے بلکہ جرنیلوں کو اپنے سامنے ایکسپوز (EXPOSE) ہوتے دیکھنے کے خواہاں تھے، وہاں انہیں سب سے بڑا نقصان یہ پہنچا کہ وہ خود بھی جرنیلوں کے سامنے ایکسپوز ہوتے چلے گئے اور جرنیلوں پر ان کی کمزوریاں اور انتظامیہ پر ان کی ڈھیلی گرت عیاں ہوتی چلی گئی۔ جرنیلوں کو سیاسی معاملات میں ملوث کرنا اور ان کے ساتھ سیاسی مسائل پر بحث کرنا گویا ان پر سوچ اور فکر کے نئے دروازے کھولنے کے مترادف تھا اور درحقیقت ہمیں سے سیاسی معاملات میں جرنیلوں کو اپنی اہمیت کا احساس ہونا شروع ہوا۔ یہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی شب جرنیلوں کے انتہائی اقدام کا نقطہ آغاز تھا۔ سیاست میں فوج کی مداخلت کا دروازہ درحقیقت خود وزیر اعظم بھٹو ۱۹۷۷ء میں کھول چکے تھے جب بلوچستان میں انہوں نے سری اور مینگل قبائل کے خلاف جنرل نکا خان کے ذریعے ملٹری آپریشن کرایا۔ جنرل نکا خان مشرقی پاکستان میں قتل عام کرانے کے سلسلے میں پہلے ہی خاصی شہرت رکھتے تھے اور مشرقی پاکستان سے ”قصاب“ کا خطاب لے کر واپس آئے تھے۔ یہ صاحب بچی دور میں بھٹو اور پیپلز پارٹی کے زبردست مخالف تھے۔ اگر ۱۹۷۳ء میں وزیر اعظم بھٹو کی مقبولیت کا گراف ۱۹۷۷ء جیسا ہوتا تو یہ ایک یقینی بات تھی کہ خود جنرل نکا خان ہی بلوچستان کے آپریشن کے بعد مسٹر بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ دیتے لیکن مسٹر بھٹو کی خوش قسمتی تھی کہ بلک کے دو بڑے صوبوں پنجاب اور سندھ میں ذرائع اعلیٰ کی انتظامی امور پر گرت اور غلام مصطفیٰ کھر کے علاوہ غلام مصطفیٰ جتوئی کی ذاتی مقبولیت نے عوام میں مسٹر بھٹو کی ساکھ قائم رکھی اور نکا خان بھٹو حکومت کا تختہ الٹنے کی جسارت نہ کر سکے۔

۱۹۷۰ء کی ہزاری انتخاباتی مہم کے دوران جنرل نکا خان زون اے کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے اور اسمبلی ہال میں ان کا دفتر ہوتا تھا۔ ایک روز مجھے ان کا بلاوا آیا جس کا مقصد مجھے وارننگ دینا تھا۔ موصوف نے اپنے مخصوص لب و لہجہ میں مجھے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ ”تم اور تمہارا اخبار بہت گڑ بڑ کرتا ہے۔ دیکھو جوان! یہ ٹھیک نہیں ہے، ہم نہیں چاہتے کہ تمہیں کوئی تکلیف ہو لیکن اب ہمیں

مجبوراً دو سر راست اختیار کرنا پڑے گا۔ یاد رکھو..... پیپلز پارٹی اور بھٹو کو ہم کبھی نہیں آنے دیں گے۔“ (مراد تھی برسر اقتدار نہیں آنے دیں گے۔) مجھے نکا خان کے یہ الفاظ کبھی نہیں بھولے۔ اس وقت بھی نہیں، جب وزیر اعظم بھٹو نے ان صاحب کو دفاع کا وزیر مملکت اور قومی سلامتی کے امور کا مشیر بنا کر کابینہ میں شامل کر لیا اور یہ صاحب اپنے ماضی کے دعووں کو بھلا کر رات دن مسٹر بھٹو کی جوتیاں سیدھی کرنے ہی کو ثواب دارین کے حصول کا دوا حدزریعہ سمجھنے لگے وزیر اعظم بھٹو کی طبیعت بھی طرفہ تماشاً تھی۔ یہ ان کے مزاج کا خاصہ تھا کہ وہ اپنے کسی بھی دور کے مخالفین کو اپنے ذمے زینتیں اور احکامات کا تابع دیکھ کر ذہنی تسکین حاصل کرتے تھے۔ برطانیہ میں میاں ممتاز دولتانہ کی بحیثیت سفیر تعیناتی، خان عبدالقیوم خان کو وزیر داخلہ بنانا، پیر علی محمد راشدی کو ایڈوائزر کا عہدہ دینا، نکا خان کو وزیر مملکت بنانا، ان کی طبیعت کے اسی پہلو کے عکاس اقدامات تھے وہ ان لوگوں کو اپنا تابع مہمل دیکھ کر بے حد تسکین حاصل کرتے تھے۔

جنرل نکا خان نے مجھے دی گئی دھمکی کو عملی جامہ پہنا یا اور ۱۹۷۰ء میں ملٹری کورٹ سے مجھے ۵ سال قید کی سزا سنائی گئی تو اس کی توثیق خود موصوف نے فرمائی تھی۔ ۱۹۷۰ء کا الیکشن میں نے جیل سے اس طرح لڑا تھا کہ میرے حلقہ انتخاب پسرور میں میرے جلسوں میں پیپلز پارٹی کے کارکن میری جگہ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی میری قد آدم تصاویر سے پر کیا کرتے تھے اور الحمد للہ کہ میں نے جیل سے یہ الیکشن اس طرح جیتا کہ پورے پاکستان میں حاصل شدہ ووٹوں کی تعداد کے اعتبار سے شیخ مجیب الرحمن کے بعد میرا نمبر دو سر تھا۔



جزوی مارشل لاء کا نفاذ

اپریل میں جہاں بی۔ این۔ اے کی تحریک اپنے عروج پر تھی اور پولیس تحریک کو روکنے میں ناکام ہو چکی تھی، وہاں ان ”ٹیکنو کریٹ صاحبان“ پر بھی لوکلاہٹ طاری تھی اور اب مسز بھٹو اپنے اقتدار کے دور عروج کے ان مشیران کرام کے مشوروں پر عمل کرنے کا فیصلہ بھگت رہے تھے۔ وزیر اعظم کے نزدیک اب یہ لوگ کسی اہمیت کے حامل نہ رہے تھے۔ وہ اپنے اقتدار کی بقا کے لئے اب یا تو اپنے اولین دور کے سیاسی رفیقوں کی طرف دیکھ رہے تھے اور یا پھر فوجی جرنیلوں کیساتھ میٹنگوں کا وارہ و سیخ کر رہے تھے۔ ایڑ مارشل اصغر خان تو انتہائی مہم کے دوران ہی مسعود محمود اور ان تمام افسران کا نام لے کر وزیر اعظم بھٹو سمیت سب کو کوالہ کے پل پر پھانسی دینے کے دعوے کرتے رہے تھے اور مشرقت کے اقتدار کا تخت ڈولنے دیکھ کر یہ مشیران کرام اب اپنا وجود بچانے کے چلر میں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھٹو حکومت کے زوال میں میرے نزدیک جہاں بے شمار اسباب و عوامل نے اپنا اچھا کر دار ادا کیا وہاں زوال کا ایک اہم سبب وہ ظلم و تشدد تھا جو وزیر اعظم سے ملنے والی کرسیوں پر بیٹھ کر بیورو کرسی کے ان کل پرزوں نے عوام پر روا رکھا تھا۔ حضرت سیدنا علی مرتضیٰؑ کا قول ہے کہ..... ”کافر کی حکومت چل سکتی ہے، مشرک اور منافق کی حکومت بھی چل سکتی ہے، لیکن ظالم کی حکومت نہیں چل سکتی“ ہمارے دور حکومت میں عوام کی زبانیں بند رکھی گئیں ان کے سر جھکائے گئے نتیجے کے طور پر جب ۷ جنوری کو انتخابات کے اعلان کے بعد ۲۱ جنوری کو قومی اتحاد کے قیام کا اعلان ہوا تو پھر ایک دم ہی عوام کے ہاتھ بھی کھلے اور زبانیں بھی۔ جھکے ہوئے سر بھی اٹھے اور گردنیں بھی۔ ظالم ہمیشہ بزول ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ صورت حال بھٹو دور کے ان ظالموں کے ساتھ بھی پیش آئی اور یہ لوگ اپریل ہی میں ری تزا کر بھاگنے کے چکر میں نظر آنے لگے یہ لوگ اتنے حواس باختہ تھے کہ مسز بھٹو نے کسی بھی معاملے میں ان لوگوں سے بات تک کرنا ترک کر دیا تھا۔ ان پر عوام کی اصل طاقت کا مظاہرہ ہو چکا تھا جو کبھی خود ان کی قوت کا سرچشمہ تھی اور جس سے انہیں ان کے مذکورہ بالا مشیروں نے بڑی حکمت عملی کے ساتھ محروم کر دیا تھا۔ انتخابات سے پہلے ان لوگوں کی بے پناہ قوت کا اندازہ نمونے کے ان چند خطوط سے کیا جاسکتا ہے جو یہ کابینہ کے وزیر کو مسز بھٹو کی طرف سے لکھا کرتے تھے۔ اب جب مسز بھٹو پر ان کی حقیقت کھلی تو انہوں نے ان لوگوں کو عضو معطل بنا کر ایک طرف

تو اپنے سیاسی رفیقوں کو اہمیت دی اور دوسری طرف فوج کے جرنیلوں کا سہارا لیا۔ یہاں بھی انہوں نے ایک طرف جہاں ایک صحیح فیصلہ کیا اور بیورو کرسی کا حصار توڑ کر عوام اور اپنے سیاسی رفیقوں کی طرف واپس آئے، وہاں ان سے جرنیلوں کا سہارا لینے کی آخری غلطی بھی سرزد ہوئی اور بد قسمتی سے بڑے آدمیوں کی غلطیاں بھی بڑی ہی ہوا کرتی ہیں اور ہر بڑے آدمی کے زوال میں اس کی کسی نہ کسی ایسی ہی غلطی نے ہمیشہ اہم کر دار ادا کیا ہے۔

سیاسی افق پر وزیر اعظم نے پنجاب کی اپنی روٹھی ہوئی طاقت اور اپنے جانشین ملک غلام مصطفیٰ کھر کو منایا اور دوبارہ اپنے پہلو میں جگہ دی۔

انتہائی مہم کے انچارج رفیع رضاحی ہار بیٹھے تھے۔ آئینی اور قانونی معاملات کی ذرا فٹنگ کے لئے مسز بھٹو حفظ بیروزادہ پر اور سیاسی اقسام و تقسیم کی فضا بحال کرنے نیز عملائے کرام کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے وزیر اعظم بھٹو پر بھروسہ کر رہے تھے۔ کور کمانڈرز کے ساتھ مختلف امور میں بھی حفظ بیروزادہ اور میں ہی وزیر اعظم کی معاونت کرتے تھے۔ بعض میٹنگوں میں حامد رضا گیلانی، حنیف خان اور ایک آدھ میں شیخ رشید، نکا خان اور عزیز احمد بھی شریک ہوئے۔ ایک دو میں غلام مصطفیٰ جتوئی اور ممتاز علی بھٹو بھی شریک رہے بھٹو صاحب جرنیلوں کے ساتھ غلام مصطفیٰ جتوئی کے خوشگوار اور خلوص پر مبنی تعلقات سے بھی استفادہ کرنا چاہتے تھے کیونکہ بحیثیت وزیر اعلیٰ سندھ انہوں نے جہاں ایک عام آدمی کا اپنے حسن سلوک اور اخلاق سے دل جیتا تھا وہاں بہت سے جرنیل بھی ان کی شرافت قلبی کا احترام دل سے کرتے تھے۔

جس میٹنگ میں ایچی نیشن کے خاتمہ کے لئے بعض شہروں میں جزوی مارشل لاء کے نفاذ کا فیصلہ ہوا اس میں وزیر اعظم کے علاوہ ”چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد ضیاء الحق“ ایڑ چیف مارشل ذوالفقار علی خان، حفظ بیروزادہ، عزیز احمد اور میجر جنرل عبداللہ ملک شامل تھے۔ وزیر اعظم بھٹو نے اس میٹنگ میں پولیس کے کردار پر عدم اطمینان کا اظہار کیا اور کہا کہ لوگ تحریک کے دوران پولیس والوں کو ہار پسناتے ہیں، یہ لوگ ان سے کولڈ ڈرنکس قبول کرتے ہیں۔ ادھر عدلیہ کا یہ حال ہے کہ ادھر ہم کسی کو گر قنار کرتے ہیں ادھر اسے مجسٹریٹ ہا کر دیتے ہیں۔ وزیر اعظم کی بات ختم ہوئی تو چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق نے رضا کارانہ پیشکش کرتے ہوئے کہا.. ”SIR WE WILL SORT THEM OUT“..... ”کیسے؟“

”ایسے مقامات پر مارشل لاء لگا دیتے ہیں جہاں زیادہ گڑ بڑ ہے“ جنرل ضیاء الحق نے جواب دیا۔ اس پر مسز بھٹو نے غور سے ان کی طرف دیکھا اور گویا ہوئے۔

”مارشل لاء کیسے لگا جائے اس کی تو آئین میں گنجائش نہیں ہے“

جنرل ضیاء الحق گویا ہوئے۔

”سر!“ آئین میں ترمیم بھی تو کی جاسکتی ہے۔“

اس تجویز کے سامنے آنے پر مسز بھٹو نے اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار کو بلا یا اور ان سے مشورہ کیا گیا۔

یہ میٹنگ اپریل کے آخری ہفتے میں ہوئی تھی اور اس کے راوی ایمر مارشل (ریٹائرڈ) و ڈوولفنٹار علی خان ہیں لیکن اس میٹنگ سے ایک روز پہلے پی۔ ایم۔ ہاؤس میں ایک اور میٹنگ ہوئی تھی۔ جس کے راوی ریٹائرڈ میجر جنرل عبداللہ ملک ہیں۔ میجر جنرل عبداللہ ملک کے بارے میں یہاں میں مختصر یہ عرض کروں گا کہ وزیر اعظم بھٹو انہیں بے حد پسند کرتے تھے اور جیسا کہ چند مواقع پر میرے سامنے انہوں نے جنرل عبداللہ ملک کے بارے میں اظہار خیال کیا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وزیر اعظم آئندہ چیف آف آرمی سٹاف کے طور پر جنرل ملک کو دیکھنا چاہتے تھے۔ جنرل عبداللہ ملک بڑی خوبیوں والے انسان ہیں اور حقیقت پسندی کے علاوہ اظہار حقیقت ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ ان دنوں بھی وہ بے دھڑک اپنی رائے کا اظہار کر دیا کرتے تھے جب مسز بھٹو کے مشیران کرام ہر وقت انہیں اٹلے سیدھے مشورے دینے میں مصروف رہتے تھے۔ جنرل ملک ذاتی طور پر مسز بھٹو کے بے حد وفادار اور مداح تھے۔ ان دنوں وہ ”چیف آف آرمی سٹاف“ کے چیف آف سٹاف تھے۔

جنرل عبداللہ ملک بتاتے ہیں کہ ایک شام گھر پر انہیں وزیر اعظم کی طرف سے فون آیا جس کے ذریعے انہیں پی۔ ایم۔ ہاؤس پہنچنے کے لئے کہا گیا تھا۔ جنرل عبداللہ ملک نے پروٹوکول کا خیال کرتے ہوئے اپنے باس جنرل ضیاء الحق کو رنگ کر کے بتانا چاہا کہ وزیر اعظم نے انہیں بلوایا ہے، لیکن چیف آف آرمی سٹاف سے ان کی بات نہ ہو سکی۔ شام کو تقریباً سات بجے وزیر اعظم ہاؤس میں حاضر ہونا تھا۔ چنانچہ وقت پر پہنچے اور ڈرائنگ روم میں انہیں بٹھایا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وزیر اعظم تشریف لے آئے اور انہوں نے جنرل عبداللہ ملک کے ساتھ پہلی مرتبہ ملکی صورت حال پر گفتگو کی۔ وزیر اعظم نے جنرل ملک سے در بابت کیا کہ کیا ایچی ٹیشن کو ختم کرنے کے لئے مارشل لاء لگا دیا جائے۔ جنرل عبداللہ ملک نے ان کو نفی میں جواب دیا اور کہا کہ حالات کو سول ذرائع سے درست کیا جائے اور سیاسی معاملات میں فوج کو کم سے کم ملوث کیا جائے۔ یوں آئین بھی تو اس کی اجازت نہیں دیتا سر! ”جنرل ملک نے اپنے دلائل کے آخر میں کہا۔

”تم نے آئین پڑھا ہے؟“ - مسز بھٹو نے قدرے حیرت کے ساتھ پوچھا۔ ”ہم تو حلف ہی آئین کے تحت اٹھاے ہیں سر؟“ جنرل ملک نے قدرے مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

اس پر مسز بھٹو نے انٹرکام اٹھایا اور دریافت کیا..... ”حقیقت کہاں ہے“ اسے بھیجیو۔“
حقیقت پیرزادہ کے آنے تک بعض مخصوص مقامات پر جزوی مارشل لاء کے نفاذ کے امکانات کا جائزہ لیا جاتا رہا اور جنرل ملک مسلسل اس خیال کو رد کرتے رہے۔ حقیقت پیرزادہ پہنچے تو انہوں نے فوراً رائے دی۔

”یہ کوئی مسئلہ نہیں، کل اسمبلی بلا کر آئین میں ترمیم کر لیں گے۔“

جنرل ملک نے پھر مخالفت کی اور کہا..... ”سر! ترمیم حالات کو مزید خراب کرے گی اور احتجاج ہو گا۔“

اس پر وزیر اعظم نے گویا فیصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”یہ سیاسی معاملہ ہے، اسے آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔“

جنرل عبداللہ ملک نے کہا..... ”ٹھیک ہے سر! آپ اس پر آرمی چیف کی رائے لے لیں“
..... میٹنگ ختم ہو گئی۔

جنرل عبداللہ ملک نے گھر واپس پہنچ کر ساری بات جنرل ضیاء الحق کو بتائی کہ وزیر اعظم نے انہیں بلایا تھا اور کل غالباً وہ آپ سے اس موضوع پر گفتگو کریں گے۔

جزوی مارشل لاء کے نفاذ کے بعد تو چیف آف آرمی سٹاف اور کور کمانڈرز کے ساتھ میٹنگیں خاصے تسلسل کے ساتھ شروع ہو گئیں اور ان میں سے بیشتر میں حقیقت پیرزادہ اور میں مسز بھٹو کے ساتھ ہوتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جزوی مارشل لاء کے نفاذ نے مکمل مارشل لاء کے نفاذ کا راستہ ہموار کر دیا تھا۔ آئین میں اس کے لئے ترمیم اگلے ہی روز کر دی گئی۔..... اور اس کے بعد جرنیلوں کی سوچ بھی مکمل طور پر بدل گئی۔ وہ بجاطور پر یہ سوچنے لگے تھے کہ اگر حفاظت کرنا ہے تو پھر وہ خود کیوں نہ اقتدار سنبھال لیں۔..... آخر مسز بھٹو کی ضرورت کیا پائی رہ جاتی ہے جب کہ قوم کا ایک بڑا حصہ ان کے اقتدار کا مخالف ہو چکا ہے۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ جرنیلوں کے نام اصغر خان کا فطرتاً ہی ان کی سوچیں بدلنے کا باعث بنا تھا اور پی۔ این۔ اے کے بعض رہنماؤں سے کچھ جرنیلوں کے تعلقات کی رپورٹیں بھی انہیں جنس بیورو کے ذریعے مسز بھٹو تک پہنچی تھیں جس کا تذکرہ وزیر اعظم نے چیف آف آرمی سٹاف سے بھی کیا تھا اس پر جنرل ضیاء الحق نے وزیر اعظم سے احتجاج کیا تھا کہ انٹر سروسز اسمبلی جنس کی موجودگی میں جرنیلوں کے پیچھے انہیں جنس بیورو کو لگانا..... فوج کی توہین کے مترادف ہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ یہ سلسلہ ختم ہونا چاہئے وزیر اعظم نے جنرل ضیاء الحق کو نہ صرف انہیں جنس بیورو کی طرف سے جرنیلوں کی نگرانی ختم کرانے کا یقین دلایا بلکہ ڈائریکٹر اسمبلی جنس اکرم شیخ کو فوری طور پر جرنیلوں کی نگرانی ختم کرنے کے احکامات بھی جاری کر دیئے۔ وہ ہر صورت جنرل ضیاء الحق کو مطمئن کرنا چاہتے تھے اور ان کی اس یقین دہانی پر انہیں مکمل بھروسہ تھا کہ قومی اتحاد کے رہنماؤں سے جرنیلوں کے تعلقات کی تحقیقات وہ خود کریں گے۔ چیف آف آرمی سٹاف کے موڈ کو دیکھتے ہوئے وزیر اعظم نے فوری نوعیت کے چند اور فیصلے بھی کئے تاکہ جنرل ضیاء الحق مطمئن ہو سکیں اور اس معنی کو انہوں نے اس گفتگو کے اگلے ہی روز اکرم شیخ کو ڈائریکٹر اسمبلی جنس بیورو کے عہدے سے ہٹا کر اپنے پیش سیکرٹری راجو رشید کو ڈی آئی بی مقرر کر دیا۔ اکرم شیخ کو ایف آئی اے کا ڈائریکٹر لگا دیا گیا اور میاں اسلم حیات ونو کو ایف۔ آئی۔ اے کی سربراہی سے ہٹا کر او۔ ایس۔ ڈی اسٹیبلشمنٹ ڈویژن لگا دیا گیا۔ ان پے در پے اقدامات کے ذریعے مسز بھٹو جرنیلوں کو یہ

باور کرانا چاہتے تھے کہ وہ ان کی وفاداریوں پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ انہیں جنس پیور و سٹون کے بعد جرنیلوں کی نگرانی مکمل طور پر ختم کر دی اور اسی اقدام نے پیور و کرہی کو پوری طرح باور کرا دیا کہ اب بھٹی حکومت کا خاتمہ قریب ہے اور فوج اقتدار سنبھالنے والی ہے۔ چنانچہ پیور و کرہی کے اہم کل پرزوں نے بھی جرنیلوں سے روابط میں اضافہ کر دیا اور مستقبل کے حکمرانوں کو خوش آمدید کہنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ۲۸ اپریل کو جب وزیر اعظم نے قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے پاکستان کے اندرونی معاملات میں امریکہ کی مداخلت کا الزام عائد کیا، اس وقت بھی ان کے اقتدار کا انحصار جرنیلوں کی صوابدید پر تھا۔ لیکن مئی کے آخر تک تو صورت حال مکمل طور پر ان کے قابو سے باہر ہو چکی تھی اور حالات پر جرنیلوں کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ گویا جرنیلوں کی مارشل لاء کا نئی دستبرد بھٹی کے ہاتھ پاؤں باندھ گیا تھا۔



آٹھواں باب

غیر ملکی ہاتھ؟

۲۸ اپریل ۱۹۷۷ء کی شام وزیر اعظم نے قومی اسمبلی کے سامنے تقریر پڑھنے سے پہلے ایک نہایت جوشیلی تقریر کی۔ اس وقت ملک پی۔ این۔ اے کے ساتھ مذاکرات شروع ہو چکے تھے۔ لیکن مذاکرات کے ذکر سے قبل تھوڑا سا جائزہ اگر مسٹر بھٹی کی تقریر کے حوالے سے پاکستان کے اندرونی معاملات میں امریکہ کی مداخلت کا لے لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہ ہو گا۔ وزیر اعظم نے اپنی جذباتی تقریر میں بحران کو بین الاقوامی سازش کا نتیجہ قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ..... ”ہاتھی مجھ سے ناراض ہے، ہاتھی نے ویت نام اور مشرق وسطیٰ پر ہمارے موقف کو تسلیم نہیں کیا۔ ہم نے عربوں کو ہتھیار سپلائی کئے ہم نے ایٹمی پلانٹ پر قومی مفاد کے مطابق موقف اختیار کیا۔ اس وقت ملک میں غیر ملکی کرنسی پائی کی طرح ہمدردی ہے۔ کراچی میں ڈالر چھ سات روپے کا ہو گیا ہے۔ لوگوں کو اذائیں دینے کے لئے پیسے دیئے جا رہے ہیں۔ جیل جانے کا معاوضہ دیا جا رہا ہے اور یہ قومی اتحاد کی سازش نہیں، بلکہ بین الاقوامی سازش ہے۔ بلڈ باؤنڈ میرے خون کے پیاسے ہیں، قومی اتحاد کے لیڈروں کے پاس اتنا دامخ اور صلاحیت نہیں کہ وہ تحریک کو یہاں تک لاسکتے۔ یہ سب کچھ بہت بڑے پیمانے پر بین الاقوامی مداخلت کا نتیجہ ہے۔

مسٹر بھٹی نے اپنی اس تقریر میں ماضی کے بعض واقعات کا حوالہ بھی دیا تھا کہ جنگ ویت نام کے دوران جب وہ وزیر خارجہ تھے تو امریکہ نے پاکستان کے موقف پر اعتراض کیا تھا اور چین کے خلاف اپنی اخلاقی امداد کا مطالبہ کرتے ہوئے ایوب خان کی موجودگی میں مسٹر بھٹی سے یہ تک کہا تھا کہ اور کچھ نہیں تو حمایت کی علامت کے طور پر پینگ پانگ کی گیندیں اور فیمل سٹینس کے ریکٹ ہی پاکستان امریکہ روانہ کر دے۔ ایوب خان نے اس موقع پر خاموشی اختیار کی لیکن مسٹر بھٹی نے صاف طور پر کہہ دیا کہ ہم کچھ نہیں بھیجیں گے کیونکہ اس کا تعلق اصولوں سے ہے۔

مسٹر بھٹی نے اپنی اس تقریر میں کہا۔

”ہاتھی کا حافظہ بڑا تیز ہوتا ہے، میرا یہ جرم معاف نہیں کیا گیا۔ چین سے ہاتھی کے شدید اختلافات تھے میں نے چین سے تعلقات بہتر بنائے تو یہ میرا ایک اور جرم بن گیا۔ میں نے مشرق وسطیٰ میں عربوں کی حمایت کی اور میری حمایت صرف زبانی یا سیاسی نہیں بلکہ فوجی نوعیت کی تھی۔ امریکہ نے ڈائسٹر

کسٹمبر کے دورے کے موقع پر بھارت کو برصغیر کی بالادست قوت قرار دیا۔ میں نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے اسلامی کانفرنس بلائی تو اسے ایک ماہ ملتوی کرنے کے لئے کہا گیا "میں نے ایسا کر دیا۔ پھر بلائی تو پھر ایک ماہ ملتوی کرنے کے لئے کہا گیا..... میں نے پھر ایسا کر دیا۔ لیکن جب تیسری مرتبہ مجھ پر اس کو ملتوی کرنے کے لئے دباؤ ڈالا گیا۔ تو میں نے شاہ فیصل کو تفصیلی خط لکھا اور انہوں نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے فروری میں اس کے انعقاد پر آمادگی ظاہر کر دی۔ (یہاں یہ واضح رہے کہ شاہ فیصل کے نام وزیر اعظم بھٹو کا وہ خط لے جانے والا میں ہی تھا۔) اسلامی کانفرنس کے بعد یاسر عرفات نے اقوام متحدہ سے خطاب کیا اور عالمی ادارے نے پی۔ ایل۔ او کو تسلیم کر لیا۔ ہم نے یونان اور ترکی کا تازہ ختم کر لیا۔ کوریانے اپنا تازہ طے کرنے کے لئے ہم سے رجوع کیا اور باقی میں ان سب باتوں کو شدید ناپسندگی کی نگاہ سے دیکھا۔ تیسری دنیا کا خیال پیش کرنے پر بھی باقی سمجھتا ہے کہ میں اس کے لئے مصیبت بن گیا ہوں۔ لیکن شکاری کتے میرے خون کے پیاسے سب سے زیادہ اس دقت ہوئے جب میں نے فرانس سے ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریداری کا معاہدہ کیا۔ کسٹمبر آئے اور مجھے دھمکی دی۔ پھر فرانس گئے اور اخبارات میں خاصا شور مچایا۔ مجھ سے کہا گیا میں اس پر مذاکرات کروں۔ میں نے کہا آپ کے ہاں انتخابات ہو رہے ہیں وہ ہو جانے میں پھر مذاکرات کروں گا۔ اب جب دوبارہ مجھ سے مذاکرات کے لئے کہا گیا تو میں نے جواب دیا کہ میرے ہاں انتخاب ہو رہا ہے۔ کل تک میں خاموش رہا لیکن اب عوام کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ یہ بہت بڑی سازش ہے۔ یہ ویسی سازش نہیں۔ بین الاقوامی سازش ہے، چہتہ جام کرنے کی باتیں ہمارے ہاں پہلے کبھی نہیں ہوئیں۔ یہ بیرونی خیالات ہیں۔ یہ بیرونی ہتھکنڈے ہیں یہ باہر سے درآمد شدہ چیز ہے۔ نفاذ شریعت کا مطالبہ کرنے والے اب اسے اصل مسئلہ تسلیم نہیں کرتے نظام مصطفیٰ کے نام پر ملک میں جنون پھیلانے والے مولانا مودودی اب یہ کہتے ہیں کہ یہ اصل مسئلہ نہیں۔ اس سے ان کے عزائم بے نقاب ہو گئے ہیں۔ کراچی، حیدرآباد اور لاہور میں مارشل لاء آئین کے تحت لگایا گیا ہے۔ ہنگامی حالت آئین کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ جزوی مارشل لاء بھی آئین کے مطابق ہے اور ہنگامی حالات کے اختیارات کے تحت لگایا گیا ہے۔ پہلے مارشل لاءوں نے آئین کو توڑا تھا۔ موجودہ مارشل لاء آئین کی حدود کے اندر اور اس کی دفعات کے عین مطابق ہے۔ پاکستان میں اسلام ہم نافذ کریں گے شراب اور جوئے پر پابندی ہم نے لگا دی ہے۔ شریعت کے نفاذ کے لئے قومی اتحاد والے اسلامی نظریاتی کونسل میں آجائیں ہم دوسرے ملکوں سے بھی سکالر بلائیں گے۔ آئین میں لکھ دیا گیا ہے کہ سات سال کے اندر تمام قوانین قرآن و سنت کے مطابق بنا دیئے جائیں گے لیکن اگر قومی اتحاد کا مسئلہ یہ ہے تو ہم ان کے تعاون سے یہ کام چھ ماہ میں بھی کرنے کو تیار ہیں۔"

وزیر اعظم کی تقریر کا ایک اہم حصہ وہ تھا جس میں انہوں نے انکشاف کیا کہ ۲۱ اپریل کو امریکی سفارت خانے کے دو افسر فون پر خوش دلی کے ساتھ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔"

THE PARTY IS OVER "پارٹی ختم ہو گئی۔ بندہ گیا..... مال ختم"..... اس موقع پر مسٹر بھٹو شدت جذبات سے لرز رہے تھے۔ ان کا چہرہ سرخ اور آواز گونج دار تھی انہوں نے کہا۔

"حضرات پارٹی ختم نہیں ہوئی اور جب تک میرا مشن پورا نہیں ہوتا یہ ختم نہیں ہوگی۔ میں نے اس پر امریکی حکومت سے احتجاج نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس سبکدوش ہونے والے امریکی سفیر کو ڈر دیا۔ امریکہ کی حکومت نے انہیں سے احتجاج کیا کہ راولپنڈی کے لوگوں نے امریکہ مردہ باد کے نعرے لگائے ہیں۔ میں نے لوگوں کو ایسا کرنے کی ہدایت نہیں کی تھی۔ لوگ جب حزب اختلاف کے پاس ڈالروں کا خزانہ دیکھتے ہیں تو اس پر احتجاج کرتے ہیں۔ جو غیر ملکی میری سبکدوشی کی پیشگوئیاں کر رہے ہیں ۱۰ میں انہیں حیرت زدہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں میں نے ماضی میں بھی انہیں حیرت زدہ کیا ہے اور اب پھر کر دوں گا۔ غیر ملکی طاقتیں میرے خون کی پیاسی ہیں لیکن میں سازشوں سے خوفزدہ ہونے والا نہیں۔"

پاکستان کے معاملات میں اس وقت غیر ملکی مداخلت کے سلسلے میں وزیر اعظم نے پہلی مرتبہ براہ راست الزام عائد کیا تھا جس سے گیلریز میں بیٹھے ہوئے سفارتی نمائندے ہکا بکا رہ گئے تھے۔ لیکن اس تقریر سے بھی کہیں زیادہ سنجیدہ انداز میں انہوں نے بیرونی مداخلت کا ذکر اپنے اس بیان طغلی میں کیا ہے جو لاہور ہائی کورٹ کے روبرو نصرت بھٹو کیس کے سلسلے میں انہوں نے داخل کیا تھا۔ یہ بیان کوٹ لکھت جیل سے انہوں نے بھیجا تھا۔ اس بیان کا بیشتر حصہ ان کی ۲۸ اپریل کی قومی اسمبلی میں تقریر پر مشتمل ہے لیکن اس میں انہوں نے بعض نئے انکشافات بھی کئے کہ کس کس طرح انہیں اقتدار سے محروم کرنے کے لئے امریکہ نے سازشیں کیں۔ وہ اپنے بیان کے پیرا گراف نمبر ۱۰۶ میں تحریر کرتے ہیں۔

"قومی اسمبلی میں میری تقریر کے بعد امریکی سفارت خانے کے چارج ڈی آفیسر نے وزارت خارجہ سے احتجاج کیا کہ حکومتی سطح پر ہونے والی بات چیت کو عوامی سطح پر موضوع بحث نہیں بنانا چاہئے تھا۔ کیونکہ اس سے آئندہ حکومتی سطح پر کوئی گفتگو کرنا مشکل ہو گا۔ امریکہ نے یہ تو کہا لیکن میرے الزامات کی صحت سے انکار یا ان کی تردید نہیں کی۔"

پیرا گراف ۱۰ میں مسٹر بھٹو لکھتے ہیں۔

"اگست ۱۹۷۷ء میں کسٹمبر نے لاہور میں مجھے دھمکی دی کہ اگر ری پراسیسنگ پلانٹ پر میں نے پالیسی تبدیل نہ کی تو مجھے خوفناک انجام کی عبرت ناک مثال بنا دیا جائے گا۔"

پیرا گراف ۱۰۸ میں لکھتے ہیں۔

"امریکی وزیر خارجہ کی تجویز پر خاموش مذاکرات کے لئے میں نے اپنے وزیر خارجہ عزیز احمد کو پیرس بھیجا ان کے پاس پاکستان کے اندرونی معاملات میں امریکہ کی مداخلت کے شواہد پر مبنی پچاس صفحات کی دستاویزات تھیں۔ لیکن امریکی وزیر خارجہ نے ان دستاویزات میں چنداں دلچسپی نہ لی بلکہ وہ سب کچھ

دیکھنے کے بعد تبصرہ کیا کہ..... ”بمبھداری ہی جو امر دی ہوتی ہے۔“ انہوں نے ہمیں باطنی کو بھلا کر تعلقات کا نیا باب کھولنے کا درس دیا اور اسی رات ہوٹل کے جس کمرے میں عزیز احمد ٹھہرے ہوئے تھے، اس کے تالے توڑ کر کمرے کی تلاشی لی گئی۔ لیکن وہ پچاس صفحات کی دستاویزات ان کے کمرے میں نہیں بلکہ پاکستانی سفارت خانے کی تحویل میں تھیں چنانچہ تالا توڑنے والوں کے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔“

پیرا گراف ۱۰۹ میں مسٹر بھٹو نے تحریر کیا ہے کہ ”۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے کچھ ہی عرصہ بعد عزیز احمد نے ان تمام دستاویزات کی ایک کاپی مسز غلام اختر خان کو اس درخواست کے ساتھ دی تھی کہ اس کا بنور مطالعہ کریں۔ اگر عدالت پسند کرے تو غلام اختر خان (موجودہ سینٹ کے چیئرمین) کو عدالت میں طلب کر کے ان سے پوچھتے کہ پاکستان کے معاملات میں مداخلت کے سلسلے میں ان کاغذات میں کیا کچھ موجود ہے“

پیرا گراف ۱۱۰ میں وہ لکھتے ہیں۔

”جون ۱۹۷۷ء میں تریبون کی اسلامی وزراء نے خارجہ کانفرنس میں بھی عزیز احمد نے یہ دستاویزی ثبوت تمام وزراء نے خارجہ میں تقسیم کئے تھے جن پہ یقین کرتے ہوئے کانفرنس نے پاکستان کے اندرونی معاملات میں بیرونی مداخلت کے خلاف ایک قرارداد پاس کی تھی۔“

پاکستان کے اندرونی معاملات میں مسٹر بھٹو کا اس درجہ اصرار بے وجہ اور بے ثبوت ہرگز نہ تھا لیکن امریکہ ہو یا کوئی اور ملک..... وہ حالات پیدا نہیں کر سکتا۔ حالات ہم خود پیدا کرتے ہیں، امریکہ تو انہیں استعمال کرتا ہے ان سے فائدہ اٹھاتا ہے سو امریکہ نے مارچ کے انتخابات کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال سے بخوبی فائدہ اٹھایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ مسٹر بھٹو اور ان کی حکومت کا دشمن تھا اور اس دشمنی کا آغاز اس وقت ہوا جب امریکہ میں کارٹرز بمقابلہ فورڈ انتخابات کے دوران مسٹر بھٹو نے امریکی سفیر کو بلا کر یہ کہا کہ وہ امریکہ کے انتخابات میں جیرالڈ فورڈ کی کامیابی کے لئے دعا گو ہیں اور اس سلسلے میں سرکاری سطح پر بھی ایسے بیانات دیے گئے جو امریکی رائے عامہ پر فورڈ کے حق میں اثرات مرتب کر سکیں۔ ان دنوں جارج ولسٹ پاکستان میں امریکہ کے سفیر تھے۔ بعد ازاں مسٹر بھٹو نے اس قسم کے بیانات جاری کئے کہ امریکہ کے پاکستان ایسے اتحادی رہی بیلگین پارٹی اور صدر فورڈ کی وائٹ ہاؤس میں موجودگی کی وجہ سے کافی اطمینان محسوس کرتے ہیں اور اگر خدا نخواستہ صدر فورڈ انتخاب ہار گئے تو اس سے خطے میں عدم اطمینان کی کیفیت پیدا ہوگی اور امریکہ کا عالمی وقار بچھوڑا ہو گا۔

امریکی انتخابات میں مسٹر بھٹو کی توقعات کے برعکس جی کارٹر کامیاب ہو گئے ڈیموکریٹک پارٹی کی روایتی بھارت نواز پالیسیوں پر کار بند رہنے کے ساتھ ساتھ وہ مسٹر بھٹو کے بیانات کی وجہ سے ان سے ذاتی پر خاش بھی رکھتے تھے۔ پاکستان اور فرانس کے مابین ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کی فراہمی کا معاہدہ جسے انہوں نے اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا تھا، اس کے پس پشت بھٹو صاحب سے ان کی ذاتی مخلصیت

کے علاوہ اسرائیل کا دباؤ بھی کار فرما تھا۔ مسٹر بھٹو نے عرب اسرائیل جنگ کے دوران جس طرح مصر اور شام کی فوجی مدد کی تھی اور فضائیہ کے علاوہ بری افواج نے بھی اسرائیل کے خلاف جنگ میں اہم کردار ادا کیا تھا، اس سے سنسجر کا جو خود بھی ایک متعصب یہودی ہیں برافروختہ ہونا قدرتی امر تھا، امریکہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر پاکستان ری پراسیسنگ پلانٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور انیمیم ہونا تو وہ اسرائیل کے خلاف بھی استعمال ہو سکتا ہے اس وجہ سے امریکہ کی طرف سے بھٹو صاحب کی مخالفت سمجھ میں آتی ہے۔

جنرل ٹکا خان ابھی فوج کے سربراہ تھے یہ ان کی ریٹائرمنٹ سے پانچ چھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ کرنل بلائی نامی ایک شخص امریکی سفارت خانے میں طبری آتشی کے عہدے پر فائز تھا وہ انتہائی اہم اور باخبر شخص تھا۔ پشاور میں ایک فوجی افسر کے ساتھ گانف کھیلے ہوئے اس نے انکشاف کیا کہ..... ”تمہارے آئندہ چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد ضیاء الحق ہوں گے۔“ اس وقت اس عہدے کے لئے تین نام سر فرست تھے اور سرومز کے لوگ انہیں کاڈ کر کرتے تھے۔ یہ تین نام جنرل شریف، جنرل مجید ملک اور جنرل عزت بخش اعوان کے تھے۔ جنرل ضیاء الحق کا نام کسی کے سامان وگمان میں بھی نہ تھا۔ چنانچہ جب کرنل بلائی نے اس فوجی افسر کے سامنے جس کا تعلق پاک فضائیہ سے تھا، جنرل ضیاء الحق کاڈ کر کیا تو بحالہ اسے بے حد تعجب ہوا۔ اس نے ایئر مارشل ذوالفقار علی خان کو یہ بات بتادی۔ لیکن وہ نہیں کر ٹال گئے اور اسے کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ چھ ماہ بعد وہی نام جو کرنل بلائی نے بتایا تھا پاکستان آرمی کے چیف آف سٹاف کے طور پر ساری دنیا کے سامنے آیا اور جنرل ضیاء الحق اپنے سے کئی سینئر جرنیلوں کو سپر سیڈ کر کے پاکستانی فوج کے سربراہ بن گئے۔

کرنل بلائی جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت ہی میں اپنی ملازمت سے ریٹائرڈ ہوا اور بعد ازاں ۱۹۸۵ء میں جب وہ پاکستان کے فوجی دور سے پر آیا تو صدر ضیاء الحق نے ایوان صدر میں اس کی ضیافت کی۔ ۲۱ مئی ۱۹۷۷ء کو جب ایک طرف پی۔ این۔ اے اور حکومت کے درمیان مذاکرات کے لئے گراؤنڈ بن رہی تھی اور دوسری جانب بھٹو حکومت کے خلاف پی۔ این۔ اے کے تحریک بھی زوروں پر تھی امریکہ کے ایک سابق سفیر جوزف فالینز اپنا ملک پاکستان کے دورے پر پہنچے یہ صاحب مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے تکلیف دہ مراحل میں بھی سولہ سترہ روز ڈھاکہ اور کراچی وغیرہ میں نظر آئے تھے۔ ان کے بارے میں حکومت کے پاس مصدقہ اطلاعات تھیں کہ یہ سی۔ آئی۔ اے کے بست اہم غنڈیدار ہیں۔ کراچی، لاہور اور راولپنڈی میں ان صاحب نے بعض پاکستانی رہنماؤں سے کئی خفیہ ملاقاتیں کیں جو حکومت کے نوٹس میں تھیں اور ان کی سرگرمیوں کا پورا ریکارڈ عزیز احمد کی تحویل میں تھا جس سے وزیر اعظم بھٹو کے الزامات کی تصدیق ہوتی تھی۔

۲۲ مئی کو جب امریکہ نے پاکستان میں اپنے سفیر کا تبادلہ کر دیا۔ تو سبک دوش ہونے والے سفیر کے ایوان صدر کے چیف آف آرمی سٹاف نے آرمی ہاؤس میں ایک ضیافت دی جس کے لئے انہوں

نے نہ تو وزارت خارجہ سے اجازت لی تھی اور نہ ہی وزیر اعظم سے (کم از کم مسٹر بھٹو نے ہمیں یہ بتایا تھا اور اگر اجازت لی بھی ہو اور بھٹو صاحب نے اس سلسلے میں غلط بیانی سے کام لیا ہو تو اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ اتنے بے بس اور کم زور ہو گئے تھے کہ اپنے چیف آف آرمی اسٹاف کو اس دعوت کی اجازت نہ دینا بھی اب ان کے بس میں نہیں رہا تھا۔)

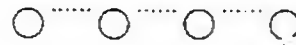
مجھے اس دعوت کی صحیح تاریخ تو یاد نہیں البتہ اتنا یاد ہے کہ یہ سول حکومت کا تختہ الٹنے سے متصل ہی کسی تاریخ میں منعقد ہوئی تھی۔ غالباً ان دنوں پی۔ این۔ اے سے ہمارے مذاکرات جاری تھے اور مجھے یاد ہے کہ اجلاس سے واپس جاتے ہوئے میں نے آرمی ہاؤس کو بھٹو نور بے خود دیکھا تھا۔

ان تمام امور کے پیش نظر یہ بات صاف تھی کہ امریکہ برقیہ پر ان حالات سے فائدہ اٹھانے کے موذ میں تھا جو بد قسمتی سے اندرون ملک وزیر اعظم بھٹو کے خلاف پیدا ہو چکے تھے۔ ایک طرف جہاں اس کے روابط بعض سیاسی رہنماؤں کے ساتھ تھے وہاں دوسری طرف پاکستانی فوج کے اعلیٰ افسران میں بھی اس کا حلقہ اثر موجود تھا۔

یہ امر آج ایک ”عظیم المیہ“ نظر آتا ہے کہ جس بھٹو کی حکومت کے خاتمہ کے لئے امریکہ نے ہر طرف ایک جال بچھا دیا تھا، اسی بھٹو کی بیٹی لیبیا پر امریکی جارحیت کے خلاف ایک حرف مذمت بھی کہنا پسند نہیں کرتی بلکہ پاکستان واپسی سے پہلے امریکہ کی آشریاد لینے واشنگٹن اور نیویارک کے چکر کاٹی ہے۔ ایک ایسی صورت حال میں امریکہ کو اپنا دوست سمجھتی اور دوسروں کو باور کراتی ہے کہ جب ”واشنگٹن پوسٹ“ میں اس سے متعلق ایسا مضمون شائع ہو رہا ہو کہ..... ”امریکہ نے پہلی مرتبہ ایک مقبول عوامی لیڈر کو غیر مقبول بنانے کا تجربہ کیا ہے جو سو فی صد کامیاب رہا ہے۔“

ۛ

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا



نواں باب

ری پرائسنگ پلانٹ کے پس پردہ حقائق

پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے اور وزیر اعظم بھٹو کو بیرونی دنیا کے سامنے اسرائیل کے اشارے پر ”دوسرا نپل“ اور انہیں عالمی امن کے لئے خطرہ ثابت کرنے کے لئے امریکہ نے جس چیز کا سب سے زیادہ سزا لیا وہ فرانس کے ساتھ مسٹر بھٹو کا انہی ری پرائسنگ پلانٹ کی فراہمی کا معاہدہ تھا۔ اس مسئلہ پر اب تک حقائق بہت کم ظاہر ہوئے ہیں اور افسانہ طرازی زیادہ کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں جذباتی نعرہ بازی نے بھی بہت کام دکھایا ہے اور وزیر اعظم بھٹو نے وانا دشمنوں سمیت نادان دوستوں نے بھی اس معاملے میں ان کے حقیقی کارنامے کو انہوں کے گرد و غبار میں چھپانے کی ہر ممکن سعی کی ہے۔ میں اس باب میں پہلی مرتبہ وہ حقائق دنیا کے سامنے لانے کی کوشش کر رہا ہوں جن پر ابھی تک تہہ در تہہ پردے پڑے ہوئے ہیں۔ بھٹو جو بھی تھے..... جیسے بھی تھے..... لیکن پاکستان کو ایک عالمی طاقت بنانے اور بین الاقوامی برادری میں اسے نمایاں ترین مقام دلانے کے شوق میں جنون کی حد تک جتا تھے اور پاکستان کو انہی قوت بنانے کا ان کا جنون اور خواب تو بہت قدیم تھا۔ انہوں نے ۱۹۶۵ء میں جب وہ ایوب کا مینہ میں وزیر خارجہ تھے نہایت جذباتی انداز میں کہا تھا۔

”اگر بھارت نے انہیں ہم بنایا تو چاہے ہمیں لگاس اور پتے کھانا پڑیں..... یا ہم بھوکے رہیں لیکن ہم بھی انہیں ہم بنا کر رہیں گے کیونکہ ہمارے پاس اس کا کوئی متبادل تو ہو گا۔ انہیں ہم کا خواب انہیں ہم ہی ہو سکتا ہے۔“

۱۸ مئی ۱۹۷۴ء کو بالآخر بھارت نے پہلا باقاعدہ ایٹمی دھماکہ کیا اور پاکستان کے عوام کی اکثریت پر اس کے جو اثرات مرتب ہوئے، وہ وزیر اعظم بھٹو کے لئے بھائے خواہ ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے تھے لوگ لامحالہ مسٹر بھٹو کی طرف سے کسی جوائی اقدام کے منتظر تھے لیکن وزیر اعظم بھٹو کی بھوری یہ تھی کہ وہ اس ضمن میں جو کچھ کر چکے تھے اور جو کچھ کرنے والے تھے، اسے گونا گوں عالمی تنازعات کے سبب ظاہر کرنے سے قاصر تھے پھر بھی انہوں نے اپنی بیشتر تقاریر اور بیانات کے ذریعے نہ صرف اندرون ملک عوام کا مورال بلند رکھا اور مجھے وزیر اطلاعات و نشریات کے علاوہ پارٹی کا سیکرٹری اطلاعات ہونے کی حیثیت میں خصوصی اقدامات کے لئے ہدایات دیں بلکہ قومی اسمبلی میں بھی بر ملا بھارت کے ایٹمی دھماکے پر شدید رد عمل کا اظہار

کیا اور واضح طور پر یہ دھمکی دے دی کہ اب ہمیں بھی اس اقدام سے باز نہیں رکھا جاسکے گا۔ مجھے انہوں نے عالمی سطح پر بھارت کے خلاف پروپیگنڈہ سائیکھک بنیادوں پر چلانے کی ہدایت کی اور خود نمائیت خاموشی کے ساتھ اس مذاکراتی مہم میں لگے رہے جو انہوں نے فرانس کی ایس۔ جی۔ این نامی فرم کے ساتھ ۱۹۷۳ء میں شروع کی تھی۔ جس کے تحت یہ فرم پاکستان کوری پراسیونگ پلانٹ کی فراہمی کی شرائط طے کر رہی تھی۔ وزیر اعظم، ہمنو خارجہ امور پر سبھی گہری نظر رکھتے تھے اس کے پیش نظر یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ بھارت کے متوقع ایٹمی دھماکے سے بے خبر تھے ان کے پاس اس سلسلے میں تمام تازہ ترین اطلاعات تھیں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بھارت نے کس طریق کار کے ذریعے اور کتنے سرمایہ خرچ کر کے یہ کامیابی حاصل کی ہے۔ تاہم انہوں نے بھارت کے ایٹمی دھماکے کے بعد بعض نمایاں پاکستانی سائنسدانوں کی اچھی خاصی گوشمالی کی تھی، جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ بھارت کی طرح کا ایٹمی دھماکا کرنا ہمارے لئے بچوں کا کھیل ہے۔

فرانسیسی فرم کے ساتھ معاہدہ میں فرانسیسی حکومت باقاعدہ فریق کی حیثیت سے شریک تھی اور تین سال تک جو مذاکرات ہوتے رہے ان میں وزیر اعظم نے فرانسیسی حکومت سمیت ایٹمی تحفظات کے عالمی ادارے آئی۔ اے۔ ای۔ اے کو بھی ہر قسم کی ضمانتیں اور یقین دہانیاں فراہم کر دی تھیں۔ ان کی تمام شرائط من و عنین تسلیم کر لی تھیں۔ انہوں نے یقین دلایا تھا کہ پاکستان کو دیا جانے والا ری پراسیونگ پلانٹ صرف صنعتی مقاصد کے لئے توانائی کے حصول تک محدود رہے گا۔ لیکن ساری یقین دہانیاں کرانے کے بعد مسٹر ہمنو نے جو اپنا کارڈ دکھایا، وہ یہ تھا کہ معاہدے میں کوئی ایک بھی ایسی شق موجود نہ تھی جس کے ذریعے پاکستان اس امر کا پابند ہوتا کہ خود اپنے ذرائع سے اپنے سائنسدانوں کے ذریعے وہ ویسٹ اینڈ دوسرا پلانٹ نہ لگا سکے گا، جس کی فراہمی فرانس سے ہونا تھی یا یہ کہ وہ دوسرا پلانٹ پاکستان کسی عالمی ادارے کی نگرانی میں دینے کا پابند ہو گا۔ بین الاقوامی تحفظات کے ضمن میں وزیر اعظم اس حد تک چلے گئے تھے کہ تسلیم کر دے پابندیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کا تصور بھی محال تھا کہ پاکستان ری پراسیونگ پلانٹ سے جوہری بم بنائے گا، ری پراسیونگ پلانٹ کی خریداری کا آئیڈیا مسٹر ہمنو کے ذہن میں ان کے سائنسی امور کے مشیر ڈاکٹر عبدالسلام اور ایٹمی توانائی کمیشن کے چیئرمین مسٹر منیر احمد خان نے والا تھا۔ کسی بھی معاملے کی تمام تجزیاتیات پر نظر رکھنے والے ہمنو نیوکلیر نیکیولوجی کے باب میں پامل معلومات اور اندرون و بیرون ملک دوسرے بے شمار مسائل میں پھنسے ہونے کے سبب اس پروجیکٹ کے تمام پہلوؤں کا خود جائزہ نہ لے سکے اور یہ سارا کام پاکستان سائنس فاؤنڈیشن اور اٹاک انری کمیشن کے ذمے ڈال کر خود اس مسئلہ کے سیاسی اور معاشی پہلوؤں میں الجھ گئے۔ سب سے بڑی بات تو ۲۰۰۰ء میں ڈالر کے اس منصوبے کے لئے سرمائے کے حصول کا سوال تھا جس کے لئے انہوں نے عالم اسلام خصوصاً خلیج ریاستوں اور تیل کی دولت سے لانا مال عرب ممالک سے رجوع کیا جہاں سے انہیں مثبت یقین دہانیاں حاصل ہوئیں۔

خصوصاً ایلیا، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، کویت اور عراق کی جانب سے انہیں ہر قسم کے مافی تعاون کی پیشکش ہوئی عرب اسرائیل جنگ کے دوران پاکستانی افواج کے ہاتھوں اسرائیلی فوج کے دانت کھٹے سڑا کے وہ عرب دنیا میں بے پناہ وقار پیسے ہی حاصل کر چکے تھے اور عرب سربراہوں کو اس امر میں ذرا بھی شک نہ تھا کہ پاکستان کا ایٹم بم اسرائیل کے مقابل خود ان کے تحفظ کی بہت بڑی ضمانت ہو گا۔ ادھر خود مسٹر ہمنو اپنی زبان سے اس معصیت پر ایک لفظ بھی کسی کو بتانے پر آمادہ نہ تھے، ملک بھر میں گنجی کے چند لوگ ان کے اصل پروگرام سے آگاہ تھے۔ جب اراکین اسمبلی بعض وزراء اور اعلیٰ حکام کی اس سلسلے میں تشویش کو انہوں نے حدت گزارتے دیکھا تو آخر ایک روز انہوں نے اقبو میں لیا اور ایک میٹنگ میں نمائیت معنی خیز انداز میں کہا: ”ہمیں اس نیکیا دہی کو ہر قیمت پر حاصل کرنا ہے، بین الاقوامی تحفظات صرف اس ایک پلانٹ تک محدود ہوں گے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے سائنسدان اور ہنرمندانے نااہل ہوں گے کہ ایک نیکیا لوجی کو دیکھنے اور سمجھنے کے باوجود خود اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ویسٹ اینڈ دوسرا پلانٹ تعمیر نہ کر سکیں جس پر ہم کسی بھی قسم کے بین الاقوامی تحفظات قبول کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔“

وزیر اعظم جانتے تھے کہ ان کا پروگرام طویل اور صبر آزما ہے لیکن انہیں اس کا بھی یقین تھا کہ آخر کار وہ عرب دوستوں کے تعاون سے اپنے خواب کو شرمندہ تعبیر ہوتے دیکھ سکیں گے۔ اس ضمن میں شاہ فیصل مرحوم کے پاس گفت و شنید کے لئے صرف مجھے ہی انہوں نے کم و بیش چار مرتبہ بھیجا تھا۔ جب کہ دوسرے ممالک کے ساتھ آفاقی، عزیز، احمد، اے۔ جی۔ این قاضی، غلام الحق، خان، منیر احمد اور نجفانے کتنے لوگ اس سلسلے میں ان کی بہت سی ایسی ہدایات پر عمل کر رہے تھے جن کے مقاصد سے شاید وہ خود بھی کم ہی آگاہ تھے۔ لیکن جب ۱۹۷۴ء میں بھارت نے راجستھان میں ایٹمی دھماکا کیا تو اچانک ساری صورت حال ہی بدل گئی۔

ایک بہت بڑی اور انقلابی تبدیلی جولائی ۱۹۷۴ء یا شاید جون میں یہ آئی کہ وزیر اعظم کو بالینڈ سے ایک خط موصول ہوا جس میں میٹارٹی میں ڈاکٹرین کی ڈگری حاصل کرنے والے ایک محب الوطن پاکستانی ڈاکٹر عبدالقادر خان نے انہیں آگاہ کیا تھا کہ وہ فلزیات کے ماہر اور اتحاد تحقیقی مضامین کے مصنف ہونے کے علاوہ ایک عالمی شہرت یافتہ کتاب کے بھی مصنف ہیں۔ لیکن کراچی سنیل مل کے نااہل اہلکاران کی خدمت سے استفادہ نہیں کر رہے اور انہوں نے ان کی کسی پیشکش کا کوئی موزوں جواب نہیں دیا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ یورینیم کی افزودگی ایسے پیچیدہ اور مشکل ترین کام میں بھی بھارت رکھتے ہیں اور آج کل بالینڈ میں اہلبوک کے مقام پر یورینیم نامی پروجیکٹ پر ایف ڈی او کے تحت کام کر رہے ہیں جس کا مقصد سینٹری فیوج سسٹم کے ذریعے یورینیم کی افزودگی ہے اور یہ پلانٹ برطانیہ بالینڈ اور جرمنی کے مشترکہ سرمائے اور سائنسدانوں کے اشتراک سے عرصہ ۲۰ سال سے اس کام میں مصروف ہے۔ ڈاکٹر قادر نے لکھا تھا کہ وہ عمیل مل کے لئے بے حد مفید خدمات سرانجام دے سکتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ان کی

پیشکشوں کا کوئی مثبت جواب نہیں دیا جا رہا۔

اس خط نے گویا وزیر اعظم کے ذہن میں طوفان برپا کر دیا اور ان کی تیز نگاہ نے تمام باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ایلٹرو پلانٹ سے ڈاکٹر تقدیر کی وابستگی اور یورپیوں کی افزودگی میں سمارت کو بھانپ لیا۔ انہوں نے خفیہ ذرائع سے ڈاکٹر تقدیر کو اطلاع بھجوائی کہ وہ چھٹی لے کر پاکستان آئیں اور ان سے ملاقات کریں۔ اس کے ساتھ مسٹر بھٹو نے پاکستانی سیکرٹ سرورسز اور سفارتخانوں کو ایلٹرو پلانٹ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لئے مشن پر لگا دیا۔ جب وہ تمام معلومات ان کے سامنے آئیں تو جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے سے ہست سے پردے ہٹ گئے انہوں نے ڈاکٹر تقدیر کے بارے میں بھی تحقیقات کرائیں اور ان کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کیں۔ جن کی روشنی میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہی وہ آدمی ہے جو پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے کے ان کے خواب کو جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر تقدیر کو ہدایات بھجوائیں کہ وہ کسی کو کسی بھی قسم کے شک و شبہ کا موقع دینے بغیر نارمل انداز میں چھٹی لے کر پاکستان پہنچیں اور ان کے طرزی سیکرٹری بریگیڈیر امتیاز سے رابطہ قائم کریں۔ دسمبر ۱۹۷۳ء میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان اپنی بیگم اور بچیوں سمیت کراچی پہنچے۔ بھٹو صاحب نے فوراً انہیں اسلام آباد بلا دیا اور سمجھایا کہ آپ لوہا بنانے کے چکر میں نہ پڑیں بلکہ ہمیں یہ بتائیں کہ یورینیم کی افزودگی کا کام کس طرح شروع کیا جاسکتا ہے۔

بھٹو صاحب اس وقت منیر احمد خان پر بھی بے حد اعتماد کرتے تھے چنانچہ انہوں نے انہیں ہدایت دی کہ وہ ڈاکٹر عبدالقدیر سے ملیں اور ان کے مشوروں پر عمل درآمد کریں۔ ڈاکٹر تقدیر منیر خان سے ملے اور انہیں صحیح طریقے پر نیو کلیئر ٹیکنالوجی کے حصول کے جدید ترین نظام سے آگاہ کر کے کراچی واپس چلے گئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے مسٹر بھٹو سے ایک ملاقات اور کی اور بتایا کہ انہوں نے سارا کام منیر احمد خان کو سمجھا دیا ہے۔ ڈاکٹر تقدیر کچھ عرصہ بعد ہالینڈ اپنی ملازمت پر واپس چلے گئے لیکن اب ان کے سامنے گویا ایک باقاعدہ مشن تھا۔ وہ کئی زبانوں کے ماہر ہونے کے سبب ڈچ، انگلش اور جرمن سائنسدانوں کی مرتبہ رپورٹوں کے کو آرڈینیٹر بھی تھے۔ اس لئے سینٹری فوج سسٹم کی تنصیبات کے ایک ایک پہلو سے آگاہ تھے۔ جانے سے پہلے انہوں نے بھٹو صاحب سے ملاقات میں ری پراسیٹنگ پلانٹ کی خریداری میں متضرر نقصانات سے انہیں پوری طرح آگاہ کر دیا تھا اور بتلایا کہ ۳۰۰ ملین ڈالر کا یہ سفید ہاتھی کم از کم بھی اپنی مکمل تنصیبات کے لئے بیس سال کا عرصہ لے گا۔ درحقیقت ری پراسیٹنگ پلانٹ کی خریداری سے پہلے پاکستان کے پاس مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے کے لئے تین بنیادی پلانٹ ضروری تھے۔

اول پیداواری ری ایکٹر، جو یورینیم تیار کر سکے۔

دوم ایندھن تیار کرنے والی ری ایکٹر

سوم بھاری پانی کا پروڈکشن پلانٹ۔

تب کہیں جا کر ری پراسیٹنگ پلانٹ کا نمبر آتا تھا۔ جو اہم ہم کی تیاری کے حصول میں مددگار ثابت ہو سکتا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہ تمام پلانٹ ایٹمی توانائی کے بین الاقوامی ادارے کے تحفظات سے بالاتر ہوتے جس کا ایک لی صدر امکان بھی نہ تھا کیونکہ ہر چیز کے لئے ہم مغربی ممالک کے محتاج تھے، پاکستان کے پاس KANUPP کے علاوہ کوئی پاور ری ایکٹر نہ تھا۔ ری پروسیس کے لئے ایندھن کے ذخائر تھے۔ مسٹر بھٹو کے جنوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے سائنسی مشیروں نے انہیں بے حد غلط اور ادھوری معلومات فراہم کر کے ایک اچھا خاصا بڑا دھوکہ دیا تھا۔ جس کا پردہ اب چاک ہو چکا تھا۔ مسٹر بھٹو فرانس کے ساتھ معاہدے کو اس نوعیت تک لے جا چکے تھے کہ اب واپسی بہت مشکل تھی۔ نہ جانے رفتن نہ پانے ماندن کی سی کیفیت تھی۔ اگر وہ معاہدہ منسوخ کرنا چاہتے تو بھاری اخراجات کا نقصان برداشت کرنے کے علاوہ معاہدے سے پھرنے کے سلسلے میں بھاری تاوان بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔ جیسے برداشت کرنے سے پاکستان کی اقتصادوی حالت قاصر تھی۔ دنیا بھر میں تیل کی قیمتیں ہوشربا حد تک بڑھی تھیں۔ ملکی مجموعی قومی پیداوار کا گراف گر رہا تھا۔ آئے دن سیلاب اور زلزلوں کا سامنا تھا۔ فصلیں اچھی نہیں جا رہی تھیں۔ غرضیکہ اقتصادی اعتبار سے پاکستان گونا گوں مشکلات کا شکار تھا اور ایسے عالم میں وزیر اعظم کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ ۳۰۰ ملین ڈالر کے اس سفید ہاتھی کو خرید سکیں یا اس کی خریداری کے اس معاہدے سے منکر ہو سکیں جس کے لئے انہوں نے ۳ سال تک مذاکرات کئے تھے اور پاکستان سے فرانس جانے والی مختلف مذاکراتی ٹیموں کے دوروں پر لاکھوں ڈالر خرچ آئے تھے انہوں نے ایک انتہائی کمیشن اور دشوار فیصلہ کیا جو انہیں کے سے مضبوط ترین اعصاب کا مالک شخص کر سکتا تھا۔ لیکن اس فیصلے کے چند اور اسباب بھی تھے جن میں اہم ترین بات یہ تھی کہ دسمبر ۱۹۷۵ء میں ڈاکٹر عبدالقدیر پھر پاکستان واپس آئے۔ کراچی ایئرپورٹ پر جب وہ اترے تو ان کے پاس صرف تین بڑے صندوق تھے جن میں ان کی یادداشتوں پر مبنی نوٹوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ وزیر اعظم بھٹو نے انہیں اسلام آباد آنے کی دعوت دی۔ وہ اسلام آباد پہنچے تو وزیر اعظم بھٹو شہنشاہ ایران کے ساتھ لاڑکانہ چلے گئے۔ لیکن جانے سے پہلے ہدایات دے گئے کہ منیر احمد خان، ڈاکٹر تقدیر کو وہ تمام کام دکھائیں جو ایک سال کے دوران ان کی ہدایات کے تحت ہوا ہے اور کام کی رفتار سے بھی آگاہ کریں۔ ڈاکٹر تقدیر کام کی نوعیت دیکھ کر بے حد مایوس ہوئے کیونکہ گاڑی وہیں کھڑی تھی جہاں وہ اسے چھوڑ کر گئے تھے۔ ڈاکٹر تقدیر کے مجوزہ پروجیکٹ کے لئے کمیشن میں ایک ایم۔ ایس۔ سی الیکٹریکل انجینئر انچارج بنایا گیا تھا جو یورینیم کی افزودگی کے منصوبے کو سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم تھا۔ وزیر اعظم بھٹو جب اسلام آباد واپس آئے تو انہوں نے ڈاکٹر تقدیر خان کو طلب کیا اور رپورٹ مانگی۔ بھلا ڈاکٹر خان کیا رپورٹ پیش کرتے؟ انہوں نے دل برداشتہ ہو کر واپس ہالینڈ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ وہ پورہ کرسی کے جال کے سامنے خود کو بے بس

پاستے تھے۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ نیو کلیئر ٹیکنالوجی کے سلسلے میں مسز بھٹو کے مشیر اور پیورڈ کریسی کے کل پریزے انہیں مسلسل غلط اطلاعات دے کر قومی سرمایہ ضائع کرتے رہے ہیں۔ مسز بھٹو نے ڈاکٹر قدیر کی ساری بات بہت توجہ سے سنی اور انہیں چند دن پاکستان ہی میں رہ کر انتظار کرنے کو کہا۔

۔۔۔ یہ موقع تھا جب مسز بھٹو نے اس سارے معاملے پر مجھے اعتماد میں لیا اور صورت حال کے تمام پہلو میرے سامنے رکھ کر مجھ سے رائے طلب کی۔ لاجلہ میں یہ باتیں جان کر بیک وقت غم و غصہ کا شکار ہوا کہ کس طرح ہماری پیورڈ کریسی جو برقی طاقت کو ضائع کرتی ہے اور کوئی محبت الوطن شخص اپنی صلاحیتوں سے وطن کو مستفید کرنا چاہتا ہے تو کس کس طرح اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ میں نے وزیر اعظم کو یہی مشورہ دیا کہ وہ ہر قیمت پر ڈاکٹر قدیر کو روکیں اور مناسب ہو گا کہ ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایک عملی طور پر آزاد ادارہ قائم کر دیا جائے جس کے وہ خود سربراہ ہوں اور اس ادارے میں انہیں جو بہتر مندر فرامہ کئے جائیں وہ سول تحکیموں یا پیورڈ کریسی کی بجائے فوج سے لئے جائیں۔ وزیر اعظم کو یہ بات غالباً پسند آئی اور انہوں نے میری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اگلے روز ڈاکٹر قدیر کو ملاقات کے لئے طلب کر لیا اور انہیں بتایا کہ وہ اس طرح ان کی سربراہی میں ایک عملی طور پر خود مختار ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ جس پر کسی قسم کا کوئی ”چیک“ نہیں ہو گا اور اس ادارے کے لئے اپنے مددگاروں کا انتخاب ڈاکٹر صاحب چاہیں تو خود پاک فوج سے کر سکتے ہیں۔ اور اگر چاہیں تو اس سلسلے میں وزیر اعظم کی عموماً بید پر اعتماد کریں۔ ڈاکٹر قدیر نے وزیر اعظم کو جواب دیا کہ وہ اپنی تنظیم سے مشورہ کر کے بتائیں گے مسز بھٹو نے انہیں مشفقانہ انداز میں حکم دیا کہ ایک گھنٹہ تک اپنی تنظیم سے مشورہ کر کے انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیں۔ ٹھیک ایک گھنٹہ بعد ڈاکٹر قدیر نے فون پر وزیر اعظم کو اطلاع دی کہ وہ بائینڈ واپس نہیں جاسکتے بلکہ پاکستان ہی میں رہ کر یورپیم کی افزودگی کا پلانٹ لگائیں گے۔ میں نے دیکھا کہ وزیر اعظم کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھ گیا تھا۔ انہوں نے میز پر اپنے مخصوص انداز میں مہم مارتے ہوئے کہا۔

“I WILL SEE THE HINDU BASTARDS NOW”

اس وقت مسز بھٹو کی مسرت کا عالم دیدنی تھا۔

وزیر اعظم بھٹو کے فیصلے اکثر بہت پلودار ہوتے تھے اور بسا اوقات ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے انہوں نے اپنے تمام رفیقوں کے مشورے نظر انداز کر کے کوئی اور ہی فیصلہ کیا ہو لیکن بعد ازاں جب ان کے فیصلے کے نتائج سامنے آتے تھے تو اکثر ہم لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ انہوں نے میرے اور اپنے درمیان طے پانے والے پروگرام کے قطعی برعکس اچانک ہی ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی تقرری اٹانک انرجی کمیشن کے ایڈوائزر کے طور پر کر دی اور حکم دیا کہ وہ کمیشن کی رہنمائی کریں اور پلانٹ لگائیں۔ چند ہفتے ڈاکٹر قدیر نے اس ادارے میں گزارے اور جب دیکھا کہ وہاں ہر چیز جلی۔ ڈیلیو۔ ڈی P.W.D کی طرز پر چل رہی ہے اور

ان کے لئے وہ کام کرنا مشکل ہے جس کے لئے انہیں تعینات کیا گیا ہے تو انہوں نے طہری سیکرٹری برائے وزیر اعظم کو اپنے جذبات سے آگاہ کر دیا کہ یہاں رہ کر وہ کوئی کام نہیں کر سکتے۔ یہ ساری باتیں امتیازی وساطت سے وزیر اعظم کے علم میں آئیں۔ انہوں نے امتیاز کو حکم دیا کہ اپنے طور پر بریگیڈیئر (اب ٹیٹنٹ جنرل) زاہد علی اکبر خان سے تمام التزامات کی تصدیق کریں۔ ڈاکٹر خان کے مطالبہ پر مسز بھٹو نے انہیں کور آف انجینئری جو نیم دی تھی زاہد علی اکبر اس کے سلسلے میں سول ورکس کے ذمہ دار تھے۔ امتیاز نے زاہد علی اکبر سے بات کی تو یہ چلا کہ معاملات میں سخت گڑبڑ کے سامنے ہو رہا بلکہ وزیر اعظم کے ساتھ فراڈ کیا جا رہا ہے اور ڈاکٹر قدیر خان وطن چھوڑ کر جانے کا سوچ رہے ہیں۔ مسز بھٹو نے یہ سب کچھ سنا تو انہیں شدید غصہ آیا۔ انہوں نے ڈاکٹر قدیر کو طلب کیا اور تمام حالات دریافت کئے۔ انہوں نے سب کچھ صاف صاف مسز بھٹو کو بتا دیا کہ لوگ کس طرح نیو کلیئر ٹیکنالوجی کے حصول کے سلسلے میں ان کے اضطراب کو بیکپلاٹ کر رہے ہیں اور انہیں غلط اطلاعات فراہم کی جا رہی ہیں۔

وزیر اعظم نے ڈاکٹر قدیر کو تسلی دے کر رخصت کر دیا اور اسی شام بیچھے پی۔ ایم۔ ہاؤس میں طلب کر لیا۔ انہوں نے مختصر ساری صورت حال مجھے بتائی اور بولے ”مولانا“ میں اس سب سے موقع کو ہاتھ سے جاتے نہیں دیکھ سکتا، یہ آدمی بہت قیمتی ہے (ان کا اشارہ ڈاکٹر قدیر کی طرف تھا) اس کا کوئی معقول حل نکالیں۔“ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ آپ اس معاملے میں سیکرٹری جنرل فرانس، ای۔ جی۔ این قاضی، سیکرٹری وزارت خارجہ آغا شاہی، عزیز احمد اور غلام احمد خان کو اعتماد میں لیں اور ان حضرات کے ساتھ ڈاکٹر قدیر کی بھی ملاقات کرادیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا مسز بھٹو۔

سخت ناراض تھے کیونکہ ان کی دانست میں۔۔۔۔۔ انہیں قوم کے سامنے شرمسار کر لیا گیا تھا۔ لاہور کی ایک میٹنگ میں جس میں آغا شاہی اور ڈاکٹر امیر محمد خان (موجودہ چیئرمین زرعی تحقیقاتی کونسل) اور جنرل امتیاز بھی موجود تھے مسز بھٹو نے۔۔۔۔۔ بڑے سخت الفاظ استعمال کیے۔ میں

یہاں وہ الفاظ درج کرنے سے قاصر ہوں۔ ان کے طیش کو دیکھتے ہوئے جنرل امتیاز نے تجویز پیش کی کہ ”ڈاکٹر امیر محمد کو ایٹمی توانائی کمیشن کا چیئرمین لگا دیا جائے۔ لیکن چونکہ ڈاکٹر امیر بھی ایٹمی سائنس دان نہ تھے اس لئے فیصلہ ہوا کہ اس ادارے کی سربراہی کسی ایٹمی ایڈمنسٹریٹر کو دے دی جائے جس کے لئے بھٹو صاحب نے جنرل رحیم الدین خان (موجودہ چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی) اور جنرل سعید قادر (موجودہ سینیٹر) کے نام تجویز کیے۔ مختلف تجاویز سامنے آتی رہیں۔ میرا مشورہ یہ تھا کہ کوشش کرو جیکٹ کو بالکل خفیہ طور پر علیحدہ کر دیا جائے۔ یہ مشورہ بعد ازاں اسے۔ جی۔ این قاضی غلام احمد خان اور آغا شاہی نے بھی دیا۔

جولائی 1976ء میں طہری سیکرٹری امتیاز نے بھٹو صاحب کو سب وزارت خارجہ سے فون کر کے انہیں میٹنگ کے فیصلوں سے آگاہ کیا جس میں یہ تمام حضرات شریک تھے تو میں موجود تھا۔ بھٹو صاحب

فرانس پر دباؤ کو تیز سے تیز کر رہے تھے۔ دوسری طرف کمونہ پلانٹ کو پوری دنیا سے پوشیدہ رکھنے کے لئے کوشاں تھے۔ تیسری طرف اندرون ملک اپوزیشن کے ایجنڈیشن سے نبرد آزما تھے اور چوتھی طرف جرنیوں کو قابو میں رکھنے کے لئے ان سے آئے دن میٹنگیں کر رہے تھے۔ اسی دوران وہ پوری دنیا میں سنٹرل ورکس آرگنائزیشن کے ذریعے ان ضروری آلات اور پرزہ جات کی خریداری کا جال بچھا رہے تھے جو کمونہ ریسرچ لیبارٹریز کے لئے درکار تھے۔ یہ سب کچھ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ایک تھانہ ان بیک وقت اتنے محاذ کھولے ہوئے تھا کہ اس کا تصور کرنا بھی محال تھا۔

ایٹمیوم کا حصول مسٹر بھٹو کا جنون تھا، لیکن ایٹمیوم بنانے کے بارے میں بیانات دینا جتنا سہل ہے اس کی تیاری اتنا ہی دشوار عمل ہے۔ امریکہ نے ۱۹۳۵ء میں بیروٹھیسا اور ناگاساکی پر جن ایٹمیوموں کے ذریعے قیامت برسائی تھی۔ وہ قدرتی یورینیم سے سائنسی سہولتوں میں ایک جزو ”بی۔بی۔یو۔۲۳۹“ کی پراسیسنگ کے بعد ہائیڈروجن کے ذریعے تیار کئے گئے تھے۔ بھارت نے ۱۹۷۳ء میں جو ایٹمیوم دھماکا کیا، اس میں بھی یہی طریق کار اختیار کیا گیا تھا اور ظاہر ہے کہ اب یہ طریق کار متروک شمار ہونا تھا۔ سائنسی ترقی ۱۹۳۵ء کے مقابلے میں اب کافی آگے نکل چکی تھی۔ امریکہ دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد سے ورجینیا یونیورسٹی میں یورینیم کی افزودگی کے ذریعے جوہری بم کی تیاری کا پروگرام شروع کر چکا تھا جس کے دو معروف طریقے ہیں۔ ایک گیس ڈیفوزن اور دوسرا سینٹری فیوج۔ اس دوسرے طریقے کی ایجاد کا کام امریکہ نے درمیان میں کئی مرتبہ روکا لیکن کیونسٹ بلاک پر اپنی برتری قائم رکھنے کی کوشش میں پھر اس منصوبے پر کام شروع کر دیا جاتا رہا۔ برطانیہ، جرمن اور ہالینڈ نے مشترکہ طور پر ۱۹۵۳ء میں اس منصوبے پر کام شروع کیا اور المیلو کے مقام پر ایک خفیہ پلانٹ اربوں ڈالر اور ہزاروں سائنس دانوں کی مدد سے شروع کیا۔ امریکہ کو اس منصوبے کی سُن گُن ملی تو اس نے اپنے تینوں حلیف ممالک پر بھی اس سلسلے میں دباؤ ڈالنا شروع کیا اور ۱۰ مارچ ۱۹۶۱ء تک ڈالنا باکہ یہ تینوں ممالک یورینیلو نامی اپنے اس منصوبے کو ترک کر دیں لیکن یہ ممالک اپنے کام میں لگے رہے۔ خود امریکہ کو سینٹری فیوج کے ذریعے یورینیم کی افزودگی میں کامیابی ۱۹۷۹ء میں حاصل ہوئی جب وہ پورٹس ماؤتھ کے مقام پر واقع پلانٹ میں اس کی عملی تصمیقات پر قادر ہو گیا۔ تاہم امریکہ کا یہ پلانٹ پوری طرح کام ۱۹۸۹ء تک شروع کرے گا۔ یہاں میں یہ واضح کرنا چاہوں کہ یورینیم کی افزودگی میں کامیابی حاصل کرنے کا مطلب ڈائریکٹ جوہری بم تیار کر لینا ہے جس کے لئے نہ تو بھاری پانی کی ضرورت ہے نہ کوئی ری ایکٹو لگانے کی پراسیسنگ پلانٹ خریدنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ مسٹر بھٹو کو جب کوڑیوں کے مول خود پاستائی سائنس دانوں اور انجینئروں کی کلاشوں سے یہ سب کچھ مل رہا تھا تو انہیں کیا ضرورت تھی کہ وہ ری پراسیسنگ پلانٹ کا سفید ہاتھی خرید کر پاکستان کی معیشت کو تباہ کرتے۔ چنانچہ وہ اس پلانٹ کو پاکستان کی اقتصادیات کے لئے سہ قتل تصور کرتے تھے۔ - کابینہ میں ڈاکٹر قدیر یا کمونہ پلانٹ کا سلسلہ کبھی زیر بحث نہیں آیا تھا۔ یہ سب کچھ صرف

چند افراد کے درمیان کا معاملہ تھا لیکن اب یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ امریکہ کو کسی طرح درحقیقت اس منصوبے کی بھی سُن گُن مل گئی ہو اور مسٹر بھٹو امریکہ کی توجہات کو صرف ری پراسیسنگ پلانٹ تک محدود رکھنے میں کامیاب نہ رہ سکے ہوں، تاہم اس کے امکانات کم ہی ہیں، لیکن خود مسٹر بھٹو کو اپنے مشیروں اور کابینہ کے کچھ اراکان پر امریکی تعلقات کا شبہ تھا۔ امریکہ مسٹر بھٹو کے اقتدار کے درپے جو ہوا تو اس کے اسباب محدود نہیں تھے، تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۰ جون کو قومی اسمبلی میں وزیر اعظم نے تقریر کے دوران ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریداری کے سلسلے میں جس شد و حد سے اپنے عوام کا اظہار کیا تھا اس کے بعد بات امریکہ کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر قدیر کا نام تو سینٹری فیوج سسٹم کی کمونہ اور سالہ کے مقام پر تعصیب کے معاملے میں بہت بعد میں سامنے آیا۔ وہ بھی ۱۹۸۲ء کے لگ بھگ جب پاکستان اس معاملے میں کامیابی حاصل کر چکا تھا اور مجھے یقین نہیں کہ امریکہ کو اس معاملے کی کوئی خبر ۱۹۷۹ء میں مل چکی ہوگی۔ تاہم امکانات موجود ہیں۔ اگرچہ وزیر اعظم بھٹو امریکہ کو ری پراسیسنگ پلانٹ کے پتھر میں ڈالے رکھنے میں پوری طرح کامیاب تھے۔

ڈاکٹر قدیر اور کمونہ ریسرچ لیبارٹریز کے بارے میں خود مسٹر بھٹو کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ہائی کورٹ اور بعد ازاں سپریم کورٹ میں اپنے حق میں ہر قسم کے دلائل دینے کے دوران وہ صرف ری پراسیسنگ پلانٹ کو امریکہ سے وجہ مخالفت بنا رہے تھے اور کمونہ ریسرچ لیبارٹریز کے ڈاکٹر قدیر کا نام ان کی زبان پر نہیں آیا تھا۔ لیکن یہاں یہ امر شک پیدا کرتا ہے کہ امریکہ محض ری پراسیسنگ پلانٹ کے مسئلے پر ان کے پیچھے نہیں پڑ سکتا تھا جب کہ امریکیوں پر یہ واضح تھا کہ پلانٹ پاکستان کے لئے ملٹری آپشن نہیں رکھتا۔ مسٹر بھٹو کے خلاف امریکہ کا پوری قوت سے محاذ کھول دینا اس شک میں جتنا کرتا ہے کہ کہیں امریکہ کو کمونہ پلانٹ کے سلسلے میں کوئی سُن گُن نہیں مل گئی تھی۔ بہر حال اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، خصوصاً اب جب کہ پاکستان مسٹر بھٹو کے خواب کی تعبیر حاصل کر چکا ہے اور ان کے خلاف تمام ممکنہ سازشیں کرنے کے باوجود امریکہ پاکستان کو اس کی راہ سے نہیں ہٹا سکا، اس کا مفہوم کرنا ایسا ضروری بھی نہیں رہا۔

وزیر اعظم بھٹو ۱۸ جون کو ہفتہ کے روز سعودی عرب روانہ ہوئے۔ جہاں شاہ خالد سے ہنگامی ملاقات کے بعد انہیں اسی روز لیبارٹری روانہ ہونا تھا۔ ان کے ہمراہ عزیز احمد، آغا شہابی، افضل سعید، مسعود بنی نور، اب۔ اب۔ فاروق، محمدی مسعود اور چند دیگر حکام تھے۔ وفد میں شریک لوگوں کے نام بھی امریکہ کو یہ یاد کرانے کے لئے کافی تھے کہ مسٹر بھٹو درحقیقت پلانٹ کی خریداری کے لئے سرمایہ حاصل کرنے ہی جا رہے ہیں ورنہ ایک انتہائی کشیدہ اندرونی صورت حالات میں اور اپوزیشن کے ساتھ مذاکرات کے انتہائی نازک موز پر ان کا ملک سے باہر جانا انتہائی ناقابل فہم نظر آتا تھا۔ ان کی ملک سے عدم موجودگی کے دوران ہی مذاکرات میں تعطل آیا جس پر سوموار ۲۰ جون کو اسلام آباد میں مولانا مفتی محمود نے شدید تنقید

کی اور یہ کہا کہ مسٹر بھٹو کو تو ہی اتحاد سے مشورہ کئے بغیر ملک سے باہر نہیں جانا چاہئے تھا انہوں نے کہا کہ مجھ سے بھٹو نے صرف لاز کانس تک جانے کی بات کی تھی اور اب وہ ابو ظہبی میں بیٹھے ہیں۔

مولانا مفتی محمود کو کیا پتہ تھا کہ مسٹر بھٹو اٹھائی تھکے ہوئے ہونے کے باوجود لاز کانس تک تھکن اتارنے کے لئے جانے کی بجائے اچانک بیرون ملک کیوں دوڑے تھے۔ اور انہوں نے کیوں اسی روز یعنی ۲۰ جون کو ابو ظہبی ٹی۔ وی۔ کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ پاکستان ہر جہت پر ری پریسنگ پلانٹ حاصل کر کے رہے گا اور کیوں مسٹر بھٹو نے تیسری اسلامی سربراہی کانفرنس بلائے کی تجویز پیش کی تھی۔ ان کے اس انٹرویو کا ایک اہم ترین حصہ جس پر امریکہ مزید چس چس ہو سکتا تھا وہ تھا جس میں انہوں نے اسلامی ممالک کے درمیان مشترکہ دفاع کے سمجھوتے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ امریکہ اور خصوصاً کارٹر کے ساتھ جتنی بڑی نیچہ آزمائی مسٹر بھٹو کر رہے تھے مفتی محمود مرحوم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان تمام باتوں سے جمی کارٹر کا یہ یقین بڑھتا ہوا چکا تھا کہ بھٹو متذکرہ بالا اسلامی ممالک کے تعاون سے ری پریسنگ پلانٹ حاصل کر لیں گے، بلکہ ان ممالک سے فرانس پر دباؤ بھی ڈلوایں گے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پلانٹ کے دیگر لوازمات بھی اسی طرح حاصل کر لیں۔ ۲۲ جون کو وزیر اعظم اچانک ہی اپنے وفد کے ہمراہ تھران سے کاہل جا چکے اور وہاں بھی انہوں نے یہی بیان دیا کہ فرانس معاہدہ کے سلسلے میں اپنے فیصلے پر قائم ہے۔ ملک سے باہر مسٹر بھٹو کے ان اعلانات نے امریکہ کو بے حد برا فروخت کیا اور یہی مسٹر بھٹو کا مقصد بھی تھا کیونکہ اس وقت ان کے سامنے اس کے سوا کوئی دوسرا مسئلہ ہی نہ رہ گیا تھا کہ وہ بریتش پر کونہ ریسرچ لیبارٹری کی تھیسٹات اور وہاں شروع ہونے والے ”اصل کام“ کو دنیا بھر سے پوشیدہ رکھ کر فرانس کے ساتھ ری پریسنگ پلانٹ کی خریداری کے معاہدے سے جان چھڑائیں۔ اگرچہ ان کا یہ منصوبہ ان کی موت کے بعد پایہ تکمیل تک پہنچا اور آج اپنے ویرینہ خواب کی تعبیر دیکھنے کے لئے وہ ہم میں موجود نہیں لیکن ایٹمی ترقی کے باب میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ خصوصاً جس طرح انہوں نے اپنی ایک غلطی کا ازالہ کرنے کے لئے ایک ایسا پلان تیار کیا جس سے عالمی طاقتیں تک غیچہ کھا گئیں، وہ ایک ایسا کارنامہ ہے جسے صرف مسٹر بھٹو ہی انجام دے سکتے تھے۔



دسواں باب

مارشل لاء کے حق میں یحییٰ بختیار کے دلائل

کراچی اور حیدر آباد میں جزوی مارشل لاء کے نفاذ اور سری ملٹری کورٹس کے قیام کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں ملک غلام جیلانی نے رٹ دائر کر دی تھی جس کے فلنچ کے سامنے ایڈووکیٹ جنرل نے حکومت کے اس اقدام کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا کہ فوج کو سول انتظامیہ کی مدد کے لئے بلا یا گیا ہے نیز یہ کہ ہائی کورٹ مارشل لاء سے متعلق درخواست کی سماعت کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ انہوں نے یہ دلائل ۱۸ مئی ۱۹۷۷ء کو دیئے تھے ۲۸ مئی کو انارنی جنرل یحییٰ بختیار نے لاہور ہائی کورٹ کے سامنے دلائل دیتے ہوئے اہم شہادت فرمایا کہ مارشل لاء ملک کو بچانے کے لئے نافذ کیا گیا ہے ۲ جون جمعرات کے روز ہائی کورٹ نے درخواست پر اپنا فیصلہ شاد یا جس کے مطابق آئین میں مارشل لاء کے نفاذ کی کوئی گنجائش نہ تھی اور شہریوں پر آرمی ایکٹ کے تحت فوجی عدالتوں میں مقدمات نہیں چلائے جاسکتے تھے۔ یہ فلنچ کا فیصلہ تھا جس میں اسلم ریاض حسین، کرم الہی چوہان، شبیر حسین قادری، ذکی الدین پال اور ڈاکٹر جاوید اقبال شامل تھے۔ انارنی جنرل یحییٰ بختیار نے دلائل دیئے تھے کہ آئین کی شق نمبر ۲۳۵ کے تحت سول انتظامیہ کی مدد کے لئے فوج طلب کرنے کی ہدایت موجود ہے لیکن فلنچ نے ان کے سابقہ دلائل کی روشنی میں اپنے فیصلے میں لکھا کہ انارنی جنرل نے لفظ ”مارشل لاء“ استعمال کیا تھا جسے سول انتظامیہ کی مدد کے لئے نافذ کیا گیا اور جیسا کہ میں اوپر درج کر چکا ہوں مسٹر یحییٰ بختیار نے ہائی کورٹ میں مارشل لاء ہی کے حق میں دلائل دیئے تھے۔ فلنچ کی جانب سے ان کے الفاظ پر فٹ غلط نہ تھی۔ یحییٰ بختیار نے فیصلے سننے کے بعد اعلان کیا کہ وفاقی حکومت اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرے گی۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا لیکن سپریم کورٹ نے ان کی یہ درخواست مسترد کر دی کہ ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف حکم اتنا ہی جاری کیا جائے۔ بروہی اور شریف الدین پیرزادہ عدالتی وکیل تھے۔ ۶ جون سماعت کی تاریخ وہی گئی اور ۶ جون کو یحییٰ بختیار نے عدالت کے روبرو اپنے دلائل میں کہا کہ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے میں تضادات موجود ہیں اس روز اولپنڈی کے بار روم سے وکلاء نے مارشل لاء کے حق میں یحییٰ بختیار کے دلائل کے خلاف احتجاج کے طور پر ان کی تصویر اتار پھینکی اور پی۔ این۔ اے کی لیگل کمیٹی کے سیکرٹری چوہدری اسماعیل نے مطالبہ کیا کہ ہائی کورٹ کے فیصلے کے بعد حکومت کو کراچی اور حیدر آباد سے مارشل لاء اٹھالینا

چاہے چنانچہ ۷ جون ۱۹۷۷ء کو پرائم فیسٹریاؤس کی ایک پریس کانفرنس میں کراچی اور میدر آباد سے جزوی مارشل لاء کے خاتمہ کا اعلان کیا گیا جس کے اگلے ہی ۱۲ ہزار ۹ سو قیدیوں نے اسی روز رہائی پائی وفاق حکومت نے اس سلسلے میں اپنا حکم واپس لے لیا تھا لیکن طرفہ تماشہ دیکھئے کہ ۷ جون ہی کو سبھی بختیار سپریم کورٹ میں مارشل لاء کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کھڑے تھے کہ ”برقہتم کے مقدمات کی سماعت پر سول عدالتوں کی اجازت داری نہیں“ (یہ عدلیہ کو جو آئین میں پانچویں ترمیم کے بعد ویسے ہی بہنو حکومت سے نالاں تھی اور خصوصاً بجٹی بختیار سے خار کھائے بیٹھی تھی مزید ناراض کرنے کی کوشش تھی اس کا نتیجہ بعد ازاں نہ صرف مارشل لاء کے نفاذ پر قانونی اور آئینی جواز فراہم کرنے کی صورت میں نکلا بلکہ جب احمد رضا قصوری کے والد کے قتل سے الزام میں مسٹر بھٹو کے خلاف مقدمہ زیر سماعت تھا اور بجٹی بختیار ہی ان کے دکلائے پتیل کے سربراہ کی حیثیت سے پیش ہوئے تھے تو عرصہ اقتدار کان کا یہ کردار فریقینا چن چکا جان کی تکھوں کے سامنے چہرہ تار پتا ہو گا) بجٹی بختیار نے سات جوں پر مشتمل سپریم کورٹ کے فلپ کے ساتھ مزید دلائل دیتے ہوئے کہ کہ سولین افراد پر فوجی عدالتوں میں بھی مقدمات چلائے جاسکتے ہیں۔ موجودہ مارشل لاء ملک میں امن و امان برقرار رکھنے کے لئے لگایا گیا ہے تاکہ طاقت کو طاقت کے ذریعے ختم کیا جاسکے اور فوجی کاہلوں قانون کے عین مطابق ہیں۔“

یہ دلائل تھے جو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء رات ۱۱ بجے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد جرنیلوں کے کام آنے اور گویا ان کے عزائم کی تکمیل کے لئے آئینی راستے بھی خود ہماری حکومت کے انارنی جنرل فراہم کر رہے تھے۔

مارشل لاء کے خلاف سندھ ہائی کورٹ میں بھی اپیل دائر کی گئی تھی جس کا فیصلہ بھی وہی تھا جو ناہور ہائی کورٹ دے چکی تھی لیکن ۹ جون کو جب سپریم کورٹ میں پھر سماعت ہوئی تو بجٹی بختیار نے اعلان کیا کہ سندھ ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف بھی سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی جائے گی۔ سندھ ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے میں لکھا تھا کہ فوج سول انتظامیہ کی مدد نہیں کر رہی بلکہ یہ سرکار مارشل لاء کا نفاذ ہے جس کی آئین میں قطعاً گنجائش نہیں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر یعقوب علی خان نے جب بجٹی بختیار سے پوچھا کہ ملک سے مارشل لاء اٹھانے کے بعد اب حکومتی فریق کی یوزیشن کیا ہے؟ تو بجٹی بختیار نے جواب دیا کہ سماعت جاری رکھنا پڑے گی کیونکہ آئین کی شق نمبر ۲۳۵ کے تحت مسلح افواج کی کارروائی کی تشریح ضروری ہے۔ اگر مذاکرات ناکام ہوئے اور ایجنسی نیشن شروع ہو گیا تو مسلح افواج کو اپنا کردار موثر طور پر ادا کرنا ہو گا۔ موجودہ صورت حال استثنائی غیر تسلی بخش ہے اس لئے سپریم کورٹ کا فیصلہ ضروری ہے۔

ملاحظہ فرمائیے کہ اس سے زیادہ کھلی دعوت جرنیلوں کے لئے اور کیا ہو سکتی تھی؟ کہ ہم رات دن مذاکرات کی کامیابی کے لئے کوشاں تھے اور بجٹی بختیار دوہائی کورٹوں کی جانب سے مارشل لاء کاراستہ روکنے کی کوششوں کے سلسلے میں ان کے فیصلوں کو نہ صرف سہوتا کر رہے تھے بلکہ مذاکرات کی ناکامی اور

مکمل حالات کے استثنائی غیر تسلی بخش ہونے پر بھی مصر تھے۔ حالانکہ ۹ جون کو تیسری سماعت پر جب چیف جسٹس یعقوب علی خان نے حکومت کا مؤقف جزوی مارشل لاء ختم ہو جانے کے بعد دریافت کیا تو یہ بہترین موقع تھا کہ دوہائی کورٹوں کا فیصلہ برقرار رہنے دیا جاتا اور مارشل لاء کے حق میں مزید دلائل نہ دیئے جاتے۔ بلکہ مناسب ہوتا کہ سندھ اور پنجاب ہائی کورٹ کے فیصلوں کو مناسب اہمیت اور تشریح دہائی تاکہ جرنیلوں پر ایک اخلاقی اور قانونی دباؤ قائم رہتا اور ۵ جولائی کی رات آپریشن فیصلے کا فیصلہ کرنے میں انہیں آسانی نہ حاصل ہوتی۔ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ نے سماعت ۳ جولائی تک ملتوی کی تھی لیکن جرنیل غالباً سپریم کورٹ کے فیصلے کا اندازہ کر چکے تھے اور اس سے پہلے سپریم کورٹ بھی مارشل لاء کے خلاف کوئی ویسی ہی فیصلہ دے دیتی جیسا کہ لاہور اور سندھ ہائی کورٹ نے دیا تھا جرنیلوں نے مناسب یہ سمجھا کہ ”آپریشن فیصلے“ کے حق میں اب تک بجٹی بختیار جتنے دلائل دے چکے ہیں انہیں پراکتفا کیا جائے۔ ۲۸ اپریل کو قومی اسمبلی میں تقریر کے دوران خود وزیر اعظم نے مارشل لاء کے حق میں جو دلائل دیئے ان میں پھر بھی بحث کے کچھ پہلو تھے اور ان کا اندازہ بھی سیاسی تھا لیکن بجٹی بختیار نے تو اپنے قانونی دلائل کے ذریعے مارشل لاء کے نفاذ کے لئے آئینی جواز فراہم کر دیئے تھے جن سے اگر جرنیل استفادہ نہ کرتے تو یہ ان کی کم عقلی ہوتی۔



میار ہواں باب

مذاکرات کی طرف پیش رفت اور پاکستان قومی اتحاد کا مصالحتی فارمولا

۳۰ اپریل کو پی این۔ اے نے راولپنڈی میں لاگ مارچ کا پروگرام بنایا تھا۔ جس کی قیادت پیر صاحب پگارا شریف کو کرنا تھی جو نظر بند رہنماؤں کی عدم موجودگی میں پی۔ این۔ اے کے سربراہ تھے۔ پورے ملک کی نگاہیں اس وقت راولپنڈی پر مرکوز تھی۔ پاکستان بھر سے پی۔ این۔ اے کے کارکنوں کو راولپنڈی پہنچانے کے انتظامات کئے گئے تھے اور یہ لاگ مارچ پی۔ ایم ہاؤس تک طے پایا تھا۔ لیکن تماشہ اس کے برعکس ہوا اور قومی اتحاد کا لاگ مارچ تو شارت مارچ میں تبدیل ہو گیا اولس کی جگہ اسی دوپہر راولپنڈی کی سڑکوں پر خود مسز بھٹو کا لاگ مارچ دیکھنے میں آیا۔ وہ ایک کھلی جیب میں سوار ہو کر اچانک شہر میں نکل آئے اور انہیں اپنے درمیان دیکھتے ہی پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ صدر میں امریکن سنٹری عمارت کے سامنے وزیر اعظم نے عوام کے ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے اپنے نام امریکی وزیر خارجہ سائرس وانس کا وہ خط بھی دکھایا جس میں انہوں نے یہ کہا تھا کہ ۲۸ اپریل کو قومی اسمبلی میں آپ کی تقریر سے ہمیں بے حد صدمہ ہوا ہے۔ کھلے بندوں الزامات عائد کرنے سے آپ کو پرہیز کرنا چاہئے تھا کیونکہ اس سے تعلقات کو صرف نقصان ہی پہنچ سکتا ہے۔ لیہین۔ اے کا لاگ مارچ بری طرح ناکام ہو گیا۔ اس کے امباب میں جہاں انتظامیہ کا کردار شامل تھا وہاں پیر صاحب پگارا شریف کی ہوٹل انٹر کانٹی نمنٹی کے دو کمروں ۶۰۱ اور ۶۰۲ میں نظر بندی بھی تھی۔ ویسے بھی پیر صاحب جیسے جلوس کی سیاست کے آدمی نہیں ہیں۔ ۹ اپریل کو بھی قومی اتحاد کے ایک جلوس کی انیس لاہور میں قیادت کرنا تھی لیکن اپنے منصب کے شایان شان نہ سمجھتے ہوئے انہوں نے وہاں بھی جلوس میں آنے سے گریز کیا تھا۔ ادھر جب ۳۰ اپریل کو لاگ مارچ کی قیادت ان کے سر ڈال دی گئی تو وہ شاید اس سے بھی گریزاں تھے۔ ان کا اپنا ایک خاص مزاج ہے جس سے ہمت کر وہ کچھ بھی نہیں کرتے۔ ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ وہ وزیر اعظم بھٹو کو بھی اتنی اہمیت نہ دیتے تھے کہ ان کے خلاف لاگ مارچ کرنے کے لئے پیدل سڑک پر نکل آتے۔ یہ ان کے منصب کے صریح خلاف عمل ہوتا۔ مجھے یاد ہے وہ مسز بھٹو سے شدید ترین نفرت کرتے تھے جس کی وجہ وزیر اعظم کا وہ فون تھا جو انہوں نے برسر اقتدار آنے کے فوراً بعد پیر صاحب کو کیا تھا۔ دراصل مسز بھٹو سندھ میں پیر صاحب کے رھائی اثر و نفوذ سے قدرے خائف تھے انہیں ہمیشہ سندھ میں

اپنا ایک ہی حریف اور مد مقابل نظر آیا جو پیر صاحب پگارا شریف تھے۔ اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد مسز بھٹو نے فون پر پیر صاحب کو خاصے ورشت انداز میں دھکی دی تھی کہ ”میرا نام ذوالفقار علی بھٹو ہے اور میں تمہیں دیکھ لوں گا۔“ لیکن جب ۳۰ اپریل ۱۹۷۷ء کو یہ طے پایا کہ پیر صاحب راولپنڈی میں قومی اتحاد سے لاگ مارچ کی قیادت کریں گے تو اچانک مسز بھٹو راولپنڈی کی سڑکوں پر نکل آئے اور پھر شہر اور کنوینٹ کا دورہ کرنے کے بعد سیدھے ہوٹل انٹر کانٹی نمنٹی پہنچے جہاں پیر صاحب نظر بند تھے۔ انہوں نے پیر صاحب سے تقریباً پچیس منٹ تک بات چیت کی۔ مسز بھٹو نے اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ”پیر پگارا کے خاندان سے ہمارے بہت پرانے مذہبی تعلقات ہیں“ اس لئے اگر انہیں قید بھی کرنا پڑا تو جیل انٹر کان سے کم نہیں ہوگی۔ ”پیر صاحب پگارا لاگ مارچ کی ناکامی کے بعد اگلی صبح تیر مئی کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ اپنے گھر پہنچا دیئے گئے۔

بھارت ۲۸ اپریل ہی کو متحدہ عرب امارات کے وزیر خارجہ احمد خلیفہ السویدی حکومت اور اپوزیشن کے درمیان مصالحت کے مشن پر اسلام آباد پہنچے انہوں نے وزیر اعظم بھٹو کو شیخ زید بن سلطان الانسان کا ایک خصوصی پیغام بھی پہنچایا تھا۔ جس میں شیخ زید نے اپوزیشن کے ساتھ مصالحت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اس سسے میں اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ وزیر خارجہ احمد خلیفہ اپنی آمد کے فوراً بعد وزیر اعظم سے ملے اور پھر سالہ گئے جہاں قومی اتحاد کے نظر بندیوں سے انہوں نے ملاقات کی یہاں سے واپسی پر احمد خلیفہ السویدی نے شیخ زید کو خط لکھ کر انہیں نے بھی سالہ کے ملاقات کی تھی۔ اور ان دونوں حضرات کی مسی کی کا مقصد صرف یہ تھا کہ قومی اتحاد کو حکومت سے براہ راست بات چیت پر آمادہ کیا جاسکے جس سے پی۔ این۔ اے کے رہنما نامعلوم وجوہ کے سبب گریزاں تھے۔ سالہ ریٹ باؤس میں اسی روز سردار سکندر حیات نے سردار قیوم سے ملاقات کی جس کا پس منظر یہ تھا کہ میں نے وزیر اعظم کو تجویز دی تھی کہ اپوزیشن رہنماؤں کی صفوں میں سردار عبدالقیوم کے محترم کردار کے سبب انہیں درمیان میں ڈال جائے تاکہ وہ مذہبت کے راستے تلاش کر سکیں۔ اب سردار سکندر حیات کو سردار قیوم سے ملاقات کے لئے اسی لئے بھیجا گیا تھا کہ وہ ان کا عندیہ معلوم کریں کہ وہ مصالحت کدو کار دار ادا کر سکیں گے یا نہیں۔ ادھر مفتی محمود نے حکومت سے بات چیت کا ایجنڈا تیار کرنے کے لئے قانونی ماہرین کو لاہور سے طلب کر لیا تھا۔ جو ۳۰ اپریل کو اگرچہ سالہ نہ پہنچ سکے لیکن اس سے کچھ امید پیدا ہو چکی تھی کہ مفتی محمود مذاکرات کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔ ۳۰ اپریل کو پی۔ این۔ اے کے قائم مقام نائب صدر خان محمد اشرف اور جنرل سیر سٹریٹیجی چوہدری رحمت الہی بھی گرفتار کر لئے گئے تھے اور توڑ پھوڑ کی بھی کئی وارداتیں ہوئیں۔ متحدہ عرب امارات کے وزیر خارجہ تو اگلی صبح وطن واپس روانہ ہو گئے، لیکن شیخ ریاض الخلیفہ معاملات سے ”ان سچ“ رہے۔ میں نے اپنی زندگی میں ان جیسا شخص بھی نہیں دیکھا وہ پاکستان کے لئے جس قدر درد اپنے دل میں رکھتے تھے، اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا کاش کہ خود پاکستانی اس کا

ایک پانچ بجے بھی اپنے دل میں رکھتے ہوئے۔ ۲ مئی کو انہوں نے رات ساڑھے آٹھ بجے سالہ میں پھر نظر بند لیدر دست سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں ترجمانی شاہ احمد نورانی نے ادا کئے تھے۔

مولانا مفتی محمود کے پیر کے اگوشے میں تکلیف تھی جس کے لئے انہیں سی۔ ایم ایچ پہنچا دیا گیا تھا۔ شیخ ریاض الغنطیب نے ان سے سی۔ ایم ایچ جا کر ملاقات کی اور وزیر اعظم بھٹو کو ایک ذاتی خط بھی انہیں دیا جس میں وزیر اعظم نے مذاکرات کی پیش کش کرتے ہوئے اس امر کی یقین دہانی کرائی تھی کہ جو بھی معاہدہ حکومت اور پی۔ این۔ اے کے درمیان طے پائے گا وہ اس پر قائم رہے گا اور سعودی عرب کے عازروں اور دوسرے دوست ممالک جو ٹائٹل کے خواہاں ہیں اس معاہدے کے گواہ ہوں گے۔ مفتی صاحب کی خواہش پر ہسپتال ہی میں پیر پگارا، نواب زادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور کی ملاقات بھی ان سے کرائی گئی۔ جس میں مسٹر بھٹو کے خط کے مندرجات زیر غور آئے۔

سعودی سفیر ۳ مئی کو سی۔ ایم۔ ایچ میں پھر مفتی محمود سے ملنے گئے اور مسٹر بھٹو کی پیشکش کا جواب دیا جس کے جواب میں مفتی محمود نے کہا کہ قومی اتحاد کی تباہی آج مسٹر بھٹو کو پیش کر دی جائے گی۔ مفتی محمود کو تفصیلی غور و خوض اور دوسرے رہنماؤں سے ملاقات کے لئے پھر سالہ پہنچایا گیا۔ اسی شام لیبیا کے وزیر خارجہ علی مرتی بھی اسلام آباد پہنچے اور انہوں نے کراٹل قذافی کی پیشکش سے مسٹر بھٹو کو آگاہ کیا کہ اگر وہ پسند کریں تو اس سلسلے میں کراٹل قذافی مصالحت کنندہ کا کردار ادا کرنے کو تیار ہیں۔ حقیقتاً پورا عالم اسلام پاکستان کے اس اندرونی خلفشار سے پریشان تھا اور جس طرح وزیر اعظم بھٹو کے عہد حکومت میں اسلامی ممالک سے قریبی رشتے استوار ہوئے تھے ان کے پیش نظر ان ممالک کی تشویش بجا تھی کیونکہ وہ امریکہ کو پیدا شدہ حالات اور بحران سے فائدہ اٹھانے کی پوزیشن میں دیکھ رہے تھے۔

۳ مئی ہی کو پی۔ این۔ اے نے سردار سکندر حیات کو قومی اتحاد کا قائم مقام نائب صدر اور محمود علی قصوری کو جنرل سیکرٹری مقرر کر دیا۔ جبکہ سندھ خصوصاً ٹیپوٹل نے ڈی۔ پی۔ آر کے سخت گرفتار سردار شیر باز مزاری، مولانا شاہ احمد نورانی، شاہ فرید الحق، مشیر پیش امام، میان محمد شوکت، ظہور الحسن بھوپالی، نواب مظفر حسین، دوست محمد فیضی اور زرین خان کو عدالت میں پیش کرنے کا حکم دیا۔ چوہدری ظہور الہی اور جے۔ اے۔ رحیم کی حراست کے خلاف درخواست کی، عدالت نے ۱۷ مئی تک منتوی کر دی گئی۔ مصطفیٰ کھر کے دو بھائیوں ملک میلادی کھراور ملک غازی کھر کی درخواست ضمانت بھی مسترد کر دی گئی تھی۔ واضح رہے کہ مصطفیٰ کھر اس وقت مسلم لیگ کے سینئر نائب صدر تھے۔

۴ مئی بدھ کو لیبیا کے وزیر خارجہ علی عبدالسلام الطربلی نے وزیر اعظم بھٹو اور مفتی محمود سے پھر ملاقاتیں کیں اور انہیں صدر قذافی کی اس خواہش سے آگاہ کیا کہ وہ پاکستان میں امن و امان دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ بیرونی طاقتیں اندرونی گڑبڑ سے فائدہ نہ اٹھاسکیں۔ وہ اسی روز وطن واپس روانہ ہو گئے اور دھرسلی۔ ایم۔ ایچ میں شیخ ریاض الغنطیب نے بھی مفتی محمود سے ملاقات کی جس کے بعد مفتی صاحب کو سالہ لے

جا یا گیا جہاں دیگر رہنماؤں کے علاوہ پیر پگارا بھی موجود تھے۔ میاں میں یہ بتانا چاہوں کہ ۳ مئی کی رات مسٹر بھٹو اور مفتی محمود کے درمیان ایک خفیہ ملاقات پر اہم سفیراؤس میں بھی ہوئی تھی۔

یہ خاص ملاقات کئی گھنٹے تک جاری رہی تھی اور اس میں وزیر اعظم نے مفتی محمود کو مذاکرات کے سلسلہ میں خصوصاً نیت کا یقین دلانے کی بھرپور کوشش کی تھی اور یہ بھی باور کرایا تھا کہ بیرون ملک سے دوست ان کے ایما پر آکر پی۔ این۔ اے کو ”پریشر“ کرنے کی کوشش نہیں کر رہے بلکہ اپنے طور پر مصالحت کرانے کے خواہاں ہیں۔ مسٹر بھٹو نے مفتی صاحب پر واضح کر دیا تھا کہ اگر کل کو وہ خود بھی برسرِ اقتدار آگئے تو آج اگر انہوں نے دوست ممالک کے ساتھ تلخی پیدا کر لی۔ تو یہ مستقبل میں خود ان کے لئے مشکلات کا باعث ثابت ہوگی۔

اس ملاقات کے اگلے روز قومی اتحاد نے وزیر اعظم کو اپنے مطالبات پر مشتمل ۱۵ صفحات کا ایک مسودہ پیش کر دیا جسے قومی اتحاد کے قانونی ماہرین کے ایک گیارہ رکنی پیٹل نے ڈرافٹ کیا تھا۔ اس پیٹل میں محمود علی قصوری، ایس ایچ ظفر، میر ظہور الحق، خالد الحق، عامر رضا خان، ایم انور باریٹ لاء مرزا عبدالغفور بیگ، نسیم فاروقی، سید احمد یوسف، رانا عبدالرحیم اور اسماعیل چوہدری شامل تھے۔

یہ وہی مطالبات تھے جو مذاکرات کے دوران پی۔ این۔ اے نے اپنے اولین مسودے میں پیش کئے تھے۔ مذاکرات میں پیش ہونے والے اس مسودے کا مکمل متن قارئین کی نذر رہے تاکہ اس ذہنی فضا کی کچھ نقشہ کشی ہو سکے جو اس وقت پی۔ این۔ اے کے حلقوں میں پائی جاتی تھی۔

پاکستان قومی اتحاد کی طرف سے پیش کردہ پراسلا مسودہ

ہر گاہ کہ پاکستان قومی اتحاد نے یہ دعویٰ کیا کہ مارچ ۱۹۷۷ء میں ہونے والے انتخابات میں حکومت اور انتظامیہ نے وسیع پیمانے پر دھاندلی کی اور اس طرح عوام کے ارادے کو نہ کام کروایا اور انتخابی عمل کو ایک فراڈ بنا دیا۔

اور ہر گاہ کہ پاکستان پیپلز پارٹی نے دعویٰ کیا کہ پاکستان قومی اتحاد نے انتخابات میں جس پیٹل پر دھاندلی ہونے کا الزام لگایا ہے اس پیٹل پر دھاندلی نہیں ہوئی اور اس نے (پیپلز پارٹی نے) ووٹوں کی اکثریت حاصل کی۔

اور ہر گاہ کہ نتیجتاً ملک میں ملک گیر سطح پر ایسی احتجاجی تحریک شروع ہوئی جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس تحریک کے نتیجے میں پارٹی لاء نافذ ہوا لیکن اس اقدام سے بھی ملک میں پیدا شدہ سیاسی مسائل کو حل کرنے یا ان پر قابو پانے میں مدد نہ ملی۔

اور ہر گاہ کہ برادر اسلامی ملکوں خصوصاً سعودی عرب، کویت، لیبیا اور متحدہ عرب امارات نے تنازعات ختم کرنے اور معاہدہ پر عمل درآمد کرانے کی یقین دہانی کرائی تھی جس کی غلط فہمی ان کی مصلحتات سے ملی کے نتیجے میں پاکستان پیپلز پارٹی کے نمائندوں اور پاکستان قومی اتحاد کے مابین موجودہ سیاسی بحران کو حل

کرنے، آزادانہ منصفانہ اور صحیح انتخابات کرانے کی ضمانت فراہم کرنے اور بد عنوانیوں کی روک تھام اور انتخابات کے لئے ضروری مناسب ماحول اور باہمی اعتماد کی فضا پیدا کرنے اور طاقت کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے مذاکرات ہونے اور اب فریقین مندرجہ ذیل معاہدہ پر متفق ہو گئے ہیں۔

۱۔ اسمبلیوں کو توڑنا

قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیاں ۷ جولائی ۱۹۷۷ء کو ختم ہو جائیں گی اور صوبائی وزراء اعلیٰ اور صوبائی وزراء اس وقت سے اپنے عہدوں پر رہیں گے۔

۲۔ نئے انتخابات

قومی اسمبلی کے انتخابات ۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو صوبائی اسمبلیوں کے ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو ہوں گے۔

۳۔ سینٹ

۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد قائم ہونے والی قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں نے سینٹ کے جو ارکان منتخب کئے ہیں وہ اس تاریخ کے بعد سینٹ کے ممبر نہیں رہیں گے اور یہ خالی نشستیں آئین کی دفعہ ۵۹ میں بتائے گئے طریق کار کے مطابق وہ نئی قومی اور صوبائی اسمبلیاں پر کریں گی۔ جب سمجھوتہ کے تحت جرنل والے انتخابات کے نتیجے میں معروضہ جرم، آجیں گی۔ سینٹ کے جو ارکان اگست ۱۹۷۷ء میں ریٹائر ہوں گے وہ اور ایڈیشنل سینیٹر اس وقت تک ممبر رہیں گے جب تک نئی قومی اور صوبائی اسمبلیاں ان کی جگہ نئے ممبر منتخب نہ کر دیں۔

۴۔ سپریم عدالت کو آئین

سمجھوتہ پر عمل درآمد اس کی پوری وفاداری کے ساتھ مکمل پابندی کے مقاصد کے حصول کے لئے ایک سپریم عدالت کو آئین قائم کی جائے گی۔ (جسے بعد ازاں کونسل کما جائے گا۔)

۵۔ یہ کونسل

(۱) وہ فرائض ادا کرے گی اور ان اختیارات سے بہرہ ور ہوگی جس کا تعین سمجھوتہ اور اس

کے شیڈول انف میں کیا گیا

(۲) سمجھوتہ کے مطابق انتخابات کے بعد نئی صوبائی حکومتیں قائم ہونے تک صوبائی گورنروں اور

صوبائی حکومتوں سے متعلق صدر اور وفاقی حکومت کے اختیارات کو بروئے کار لائے گی۔

(۳) قبائلی علاقوں سے متعلق صدر اور صوبوں کے گورنروں کے اختیارات کونسل کی ہدایت کے تحت استعمال ہوں گے۔

(۴) آزاد، جموں و کشمیر سے متعلق صدر پاکستان اور وفاقی حکومت کے اختیارات کونسل کی ہدایت کے تحت استعمال ہوں گے۔

۶۔ صوبائی حکومتیں

صوبائی اسمبلیاں ختم ہونے کے بعد صوبوں کے انتظامیہ اور قانون سازی کے اختیارات و کونسل کی ہدایت اور کنٹرول کے تحت صوبوں کے نئے گورنروں کو حاصل ہوں گے جو اس سمجھوتہ کے فریقین کی باہمی رضامندی سے مقرر ہوں گے اور وہ آئین پاکستان کے تحت صوبائی گورنر کو جو اختیارات حاصل ہیں ان کو بروئے کار لائیں گے۔

ایکٹ، آرڈی نمنس ریگولیشنز اور آرڈر

قانون ساز ادارے کوئی قانون نہیں بنائیں گے اور صدر یا صوبہ کے گورنر اس وقت تک کوئی آرڈی نمنس، ریگولیشن یا آرڈر نافذ نہیں کریں گے جب تک اس سلسلہ میں کونسل کی پیشگی منظوری حاصل نہ کر لی جائے۔

۷۔ کلیدی تفریباں

(۱) کونسل کو تمام کلیدی آسامیوں پر نئی تفریباں کرنے یا ان پر نظر ثانی کرنے کا اختیار حاصل ہو گا۔ ان آسامیوں میں وفاقی اور صوبائی وزراء اور ڈویژنوں کے سیکرٹری و تمام شعبوں کے سربراہ شامل ہیں۔ بشمول قانون نافذ کرنے والے اور سیکورٹی و تقویت کرنے والے اداروں کے سربراہوں، ایڈیشنل کسٹمز، ڈپٹی انسپکٹرن جنرل پولیس، ڈپٹی کسٹمز اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں کے مذکورہ بالا عہدوں پر تفریباں اور تبدیلیاں کونسل کے کنٹرول میں ہوں گی۔

(۲) وفاقی حکومت صوبائی حکومت کے کسی عہدیدار کو کوئی تحریری یا زبانی حکم نہیں دے گی۔ تاکہ صوبائی انتظامیہ کی غیر جانبداری قائم رہ سکے۔

۸۔ بلوچستان

بلوچستان میں متعین مسلح افواج معاہدہ کے بعد چند دن کے اندر اندر زمانہ امن کی چھان بینوں میں باہمی جائیں گی اور عوام کا اعتماد بحال کرنے اور ایسی فضا پیدا کرنے کے لئے فوری اقدامات کئے جائیں گے کہ

لوگ انتخابات میں حصہ لینے کے لئے اپنے گھروں میں واپس آئیں۔ بلوچستان میں جن افراد کو گھر باہر چھوڑنا پڑا تھا یا جو زخمی ہوئے تھے ان کی اور ان کے اہل خانہ کی بحالی کے لئے مناسب مالی اور انتظامی اقدامات کئے جائیں گے۔

فروری ۱۹۷۳ء کے بعد حکومتی اقدامات کے نتیجے میں جن لوگوں کی زندگیاں ضائع ہوئیں ان کے کنبوں کو مناسب امداد دی جائے گی۔ اس سمجھوتہ کے نتیجے میں بیرون ملک یا پاکستان کے اندر جو شخص (یا اس کا کنبہ) اپنے گھر واپس آئے گا۔ اسے ہراساں نہ کرے اور ڈرانے دھمکانے سے اجتناب کیا جائے گا اور نہ ہی ان میں سے کسی کے خلاف کسی قسم کے ارتکاب جرم میں مقدمہ چلایا جائے گا۔

۹ - آزاد جموں و کشمیر

آزاد جموں و کشمیر اسمبلی کو نسل ۷۷-۷۸-۷۹ کو توڑ دی جائے گی اور موجودہ صدر، وزیراعظم اور وزیر اپنے عہدوں پر برقرار نہیں رہیں گے اور آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی رضامندی سے نگران صدر مقرر کیا جائے گا جس کو حکومت آزاد کشمیر کے صدر کے تمام اختیارات حاصل ہوں گے۔

آزاد جموں و کشمیر کے عبوری آئین کے ایکٹ ۷۷ میں جو یکطرفہ ترمیمیں نہ کی گئی وہ واپس لے لی جائیں گی اور ۷۷-۷۸-۷۹ اور آزاد کشمیر اسمبلی اور صدر آزاد کشمیر کے عہدہ کے لئے انتخابات ہوں گے۔ انٹیشن کنیشن کا تقرر اور دوسرے انتخابات آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے مشورے سے کئے جائیں گے۔

۱۰ - آئینی ترمیمیں

پاکستان کے آئین میں جتنی ترمیمیں کی گئی ہیں جن سے آئین میں دئے گئے بنیادی حقوق پر اثر پڑا ہے جن سے عدالتوں کے اختیارات ختم یا محدود ہوئے ہیں اور اعلیٰ عدالتوں کے عدالتی اختیارات پر زور پڑی ہے (جیسا کہ شیڈول 'ب' میں بتایا گیا ہے) وہ اس معاہدہ کی رو سے فی غور غیر مؤثر ہو جائیں گے۔

۱۱ - بلگی کی حالت کا خاتمہ

بلگی کی حالت فوراً ختم کر دی جائے گی۔ تمام بنیادی حقوق بحال ہو جائیں گے ان حقوق کو محدود معطل یا ختم نہیں کیا جائے گا۔ سمجھوتہ کی مدت کے دوران بلگی کی حالت از سر نو نافذ نہیں کی جائے گی سوائے کونسل کی پیشگی منظوری کے اور ان پابندیوں کے تحت جو کونسل نافذ کرے گی۔

۱۲ - ڈیفنس آف پاکستان آرڈی نانس کا خاتمہ

ڈیفنس آف پاکستان آرڈی نانس فی الفور واپس لے لیا جائے گا اور اس کے تحت جو ریویول قائم ہیں وہ ختم ہو جائیں گے اس آرڈی نانس کے تحت جن لوگوں کو سزائیں ملی ہیں یا جن پر مقدمے چل رہے ہیں ان کو رہا کر دیا جائے گا اور ڈیفنس آف پاکستان آرڈی نانس اور ڈیفنس آف پاکستان روٹو کے تحت جو

مقدمے چل رہے ہیں وہ واپس لے لئے جائیں گے۔

۱۳ - خصوصی عدالتیں

کسی بھی قانون کے تحت قائم ہونے والے ریویول اور خصوصی عدالتیں فی الفور ختم ہو جائیں گی اور عدالتوں یا ریویولوں سے سزا یا پاب ہونے والے تمام افراد فوراً رہا کر دیے جائیں گے خواہ سزائی میں عادی ہوں جتنی سزا وہ جھگٹ چکے ہیں وہی ان کی قید تصور ہوگی۔ کسی بھی خاص عدالت یا ریویول میں جو مقدمے زیر سماعت یا سماعت کی ضرورت ہوگی تو یہ مقدمات عام عدالتوں میں پیش کئے جائیں گے اور ان کی سماعت عام قوانین کے تحت ہوگی۔

۱۴ - آرمی ایکٹ ۱۹۵۲ء

ایکٹ ایکس ۱۹۷۷ء یا دوسرے قوانین کے ذریعے آرمی ایکٹ ۱۹۵۲ء میں جو ترمیمیں کی گئی ہیں فی الفور واپس ہو جائیں گی اور ان کے تحت جن لوگوں کو سزائیں مل چکی ہیں وہ رہا کر دیے جائیں گے۔

۱۵ - قیدیوں اور نظر بندوں کی رہائی

حفاظتی انتہائی قوانین کے تحت جن لوگوں کو نظر بندی یا حراست میں رکھا گیا ہے یا جن کو قانون نافذ کرنے والے اداروں یا مسلح افواج نے حراست میں رکھا ہے جن پر مقدمے چل رہے ہیں یا جن کو انتخابات یا ٹیم جنوری ۱۹۷۲ء کے بعد سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں ارتکاب جرم پر سزا دی ہے۔ ان کو فوراً رہا کر دیا جائے گا اور ان کے خلاف درج یا فیصلہ طلب مقدمات یا ان کی نقل و حرکت محدود کرنے سے متعلق تمام احکام واپس لے لئے جائیں گے۔ اگر ضروری ہو تو حکام قانون اپیل کے مرحلہ میں بھی یہ کارروائی کریں گے سیاسی کارکنوں کے خلاف نئے مقدمات قائم نہیں کئے جائیں گے نہ ہی ایسے افراد کو گرفتار یا نظر بند کیا جائے گا۔

فریقین کے ارکان جو دونوں طرف سے برابر تعداد میں ہوں گے پر مشتمل ایک کمیٹی ان تمام معاملات و مقدمات کا جائزہ لے گی جو حکومت کے خیال میں اس پیرا گراف کے ذیل میں نہیں آتے۔ اس سلسلے میں حکومت دو ہفتوں کے اندر ایسے افراد کی فہرست مہیا کرے گی۔

۱۶ - سزا یافتہ سیاسی کارکن

یکم جنوری ۱۹۷۲ء کے بعد جن سیاسی لیڈروں یا کارکنوں کو ان کی سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر گرفتار کیا گیا ہے یا ان پر مقدمات چلائے گئے اور جن کو ریویولوں یا عدالتوں نے سزائیں دی ہیں۔ وہ فوراً رہا کر دیے جائیں گے اور ان کو بری تصور کیا جائے گا اس سلسلے میں تمام مقدمات جو عدالتوں یا ریویولوں میں فیصلہ طلب

پڑے ہیں یا تفتیش کرنے والے اداروں کے پاس ہیں وہ فوراً واپس ہو جائیں گے۔

۱۷- ریٹیف اور امداد

مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے دوران یا اس کے بعد انتخابات کے عواقب کے نتیجہ میں جن لوگوں کی جانیں ضائع ہوئیں ان کے کنبوں کو مناسب امداد دی جائے گی۔ مذکورہ بالا حالات میں جو لوگ زخمی ہوئے یا جن کو نقصان پہنچان کو معقول مالی امداد دی جائے گی۔

۱۸- جلا وطن

وہ تمام پاکستانی جن کو پاکستان سے جلا وطن کر دیا گیا ہے یا جن کو پاکستان واپس آنے کی اجازت نہیں ہے ان کو بلا خوف و خطر ملک میں واپس آنے کی آزادی ہوگی۔
جن لوگوں کو مصوبوں میں گرفتار کیا گیا اور ان کو مصوبوں سے باہر لے جایا گیا اور حراست میں رکھا گیا وہ واپس لائے جائیں گے اور ربا کر دیئے جائیں گے اور کونسل کو اس امر کی اطلاع دی جائے گی۔

۱۹- انتخابات سے متعلق سرگرمیاں

انتخابات سے متعلق سرگرمیوں میں حصہ لینے پر کسی شخص کو گرفتار نہیں کیا جائے گا، حراست میں نہیں رکھا جائے گا اس پر مقدمہ نہیں چلایا جائے گا اور نہ ہی ہراساں کیا جائے گا۔

۲۰- سیاسی سرگرمیوں پر پابندی

سیاسی سرگرمیوں کو محدود کرنے کے لئے دفعہ ۱۳۳ یا کسی اور قانون کے تحت کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی اور نہ ہی لاؤڈ سپیکر کا استعمال ممنوع قرار دیا جائے گا۔

۲۱- پریس

آزادی صحافت پر عائد تمام پابندیاں ختم ہو جائیں گی۔ یکم جنوری ۱۹۷۲ء کے بعد جن اخباروں یا جرائد کے ڈیپوزٹ منسوخ کئے گئے یا واپس لے لئے گئے وہ فوراً بحال ہو جائیں گے۔ نئے ڈیپوزٹ حاصل کرنے کی آزادی ہوگی۔ جو پریشر پبلشر اور صحافی سزا یاب ہوئے ہیں یا حراست میں ہیں فوراً رہا کر دیئے جائیں گے۔ ضبط شدہ پریس اور جائیداد واپس کر دی جائے گی اور جرمانے کی رقم واپس کر دی جائے گی۔ نیوز پرنٹ کا کوٹہ اور حکومتی اور نیم حکومتی اداروں کے اشتہار دینے میں امتیازی پالیسی فوراً ختم کر دی جائے گی۔

۲۲- سرکاری ذرائع ابلاغ

جو ذرائع ابلاغ سرکاری ملکیت یا کنٹرول میں ہیں وہ خبریں اور نظریات توازن اور غیر جانبداری کے ساتھ پیش کریں گے۔ پاکستان ٹیلی ویژن پاکستان براؤڈ کاسٹنگ کارپوریشن اور جنرل پریس سروسٹ کے اخبارات و جرائد پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان قومی اتحاد کی خبروں کو یکساں طور پر پیش کریں گے اور یکساں جگہ یا وقت دیں گے۔ یہ ذرائع ابلاغ سیاسی جماعتوں اور کارکنوں کی کردار کشی نہیں کریں گے اور کونسل کے کنٹرول میں ہوں گے اور اس کی ہدایات کی پابندی کریں گے۔

۲۳- ٹریڈ یونینز

تمام قانونی ٹریڈ یونین سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور ان پر عائد پابندیاں ختم کر دی جائیں گی کسان اور مزدور لیڈر اور کارکن جو حراست میں ہیں فی الفور رہا کر دیئے جائیں گے۔

۲۴- الیکشن کمیشن

الیکشن کمیشن، کمیشن کے چیئرمین اور چار ایسے ارکان پر مشتمل ہو گا جو قومی اتحاد کے مشورے سے مقرر ہوں گے الیکشن کمیشن کو ایسے افسر اور اہلکار اور عدالتی افسر مقرر کرنے کا اختیار ہو گا جن کی تقرری فراغ کسی بجا آوری کے لئے ضروری ہوگی۔ الیکشن کمیشن کو ایسے افراد کو سزا دینے کا اختیار ہو گا جو ڈپلن کی خلاف ورزی کریں گے یا کسی بد عنوانی، غیر قانونی اقدام یا بے قاعدگی کے مرتکب ہوں گے۔

۲۵- الیکشن کمیشن کا اختیار

الیکشن کمیشن کو معقول قانونی، مالی اور انتظامی اختیارات دئے جائیں گے اور اسے اختتامی یا لازمی اور ضبطی کے احکام جاری کرنے کا اختیار ہو گا۔ انتخابات منصفانہ آزادانہ اور صحیح طور پر کرانے کے لئے کمیشن کو افراد کی رہائی یا گرفتاری کے احکام معطل کرنے کے لئے ہائی کورٹ کے اختیارات حاصل ہوں گے شیڈول سی کے مطابق انتخابی قوانین میں فوراً ترمیمیں کی جائیں گی۔

۲۶- مسلح افواج انتخابی کمیشن کی مدد کریں گی

عوامی نمائندگی کے قانون ۱۹۷۶ء میں آئین کی دفعہ ۲۳۵ کے حوالے سے مناسب ترمیمیں کی جائیں گی تاکہ کمیشن انتخابات کروانے کے لئے پاکستان کی مسلح افواج سے امداد و عملہ حاصل کر سکے اور فیڈرل سیکورٹی فورسز رینجرز اور پولیس کو انتخابات کے سلسلے میں کوئی سہولت نہ دی جائے۔

الیکشن کے نتائج کا اعلان الیکشن کمیشن کرے گا اور عوامی ذرائع اعلان بشمول ریڈیو ٹیلی ویژن اور ٹیلی ویژن پر ایس ٹی وی کے اخبارات انتخابات کے نتائج کے بارے میں الیکشن کمیشن کے تحریری اہتیار کے بغیر کوئی اطلاع جاری نہیں کریں گے۔

۲۸- انتخابی عذر داریاں

مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے سلسلہ میں وائر شدہ تمام انتخابی عذر داریاں ختم تصور ہوں گی مذکورہ بالا انتخابات کے سلسلے میں جس امیدوار نے انتخابی اخراجات کا گوشوارہ داخل نہیں کیا اسے کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔

۲۹- پاکستان قومی اتحاد کو نسل کو ان وفاقی اور صوبائی افسروں کی ایک فرسٹ پیش کرے گا جنہوں نے اس کے خیال میں ۱۷ جنوری ۱۹۷۷ء کے بعد بد عنوانیاں کیں اور وحیاناہ مظالم ڈھائے۔ کو نسل ان افراد کے خلاف الزامات کی تحقیقات کرانے کی اور الزامات ثابت ہونے کی صورت میں مناسب انضباطی یا قانونی کارروائی کی جائے گی۔

۳۰- (۱) یکم جنوری ۱۹۷۷ء کے بعد اسلحہ کے جتنے لائسنس جاری کئے گئے ہیں وہ معطل کئے جائیں گے اور ان لائسنسوں کے تحت جاری ہونے والا اسلحہ قریبی فوجی اسلحہ خانہ میں جمع کرا یا جائے گا۔

(۲) یکم جنوری ۱۹۷۷ء کے بعد ممنوعہ بور کے اسلحہ کے جتنے لائسنس جاری کئے گئے ہیں ان کی تفصیل اور لائسنس ہولڈروں کے کوائف اسلحہ کی تفصیل اور لائسنس جاری کرنے والے حکام کی فرسٹ سمجھوتہ پر دستخط ہونے کے بعد ایک ہفتہ میں کو نسل کو پیش کی جائے گی اور کو نسل اس پر مناسب کارروائی کرے گی۔

۳۱- جرائم کے مرکب افراد کے خلاف کارروائی

الیکشن کمیشن نے مارچ ۱۹۷۷ء کے دوران جن امیدواروں 'افسروں' اور دیگر افراد کے خلاف تحقیقات کیں اور نظریہ ظاہر معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کیا انتخابی قانون کی خلاف ورزی کی بیضفانہ انتخابات کے عمل میں رکاوٹ پیدا کی یا دیگر جرائم کا ارتکاب کیا ان کے خلاف فی الفور مقدمے چلائے جائیں گے۔

۳۲- ایف ایف ایف کا کنٹرول

فیڈرل سیکورٹی فورسز آرمی جنرل، ہیڈ کوارٹری کمان اور کنٹرول میں دے دی جائے گی۔

جونہی کو نسل کو محسوس ہو گا کہ اس معاہدہ پر عمل در آمد میں مشکلات خائل ہیں تو وہ صدر کو ایسے آرڈیننس آرڈر کا مسودہ پیش کرے گی جس سے اس کے خیال میں یہ مشکلات دور ہو سکیں 'صدر مسودہ ملتے ہی اس پر دستخط کرے گا اس کو نافذ کر دیں گے اور اگر انہوں نے ۲۳ گھنٹوں میں ایسٹ کیا تو یہ تصور کیا جائے گا کہ انہوں نے دستخط کر دئے ہیں اور وہ قانون پاکستان کا حصہ بن جائے گا۔

۳۳- صورت حال کو جون کا تو ن برقرار رکھنا۔

(۱) سمجھوتہ پر دستخط ہونے کے بعد اور اس کے بعد انتخابات مکمل ہونے تک وزیر اعظم اور ان کی حکومت پالیسی پر مبنی کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرے گی جس سے ملک کے مابین اور جاہد اور پراثر بڑے اور اگر کسی وجہ سے ایسا فیصلہ ناگزیر ہو جائے تو وہ کو نسل کی رضامندی سے کیا جائے گا۔

(۲) سمجھوتہ پر دستخط ہونے کے بعد انتخابات ہونے تک وفاقی اور صوبائی حکومتیں پاکستان میں کسی سیاسی جماعت یا تنظیم پر پابندی عائد کرنے کے لئے کوئی اقدام نہیں کریں گی۔

(۳) اگلے عام انتخابات تک آئین میں کوئی ترمیم نہیں کی جائے گی سوائے ان ترمیم کے جو اس سمجھوتہ پر عمل در آمد کے سلسلے میں ضروری ہوں گی۔

۳۵- عمل در آمد

(۱) سمجھوتہ کی شق ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۲۵ اور ۲۷ پر عمل در آمد کے لئے عارضی ترمیم کی ضرورت ہوگی اور ان ترمیم کا اہتمام پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کے چیئرمین کی ذمہ داری ہوگی اس سمجھوتہ پر فوری عمل در آمد کے لئے قانون سازی اور ترمیم کا اہتمام اور ہدایات اور نوٹی فیکیشن کا اجرا جلد از جلد ہو گا۔

(۲) وفاقی اور صوبائی حکومتیں سمجھوتہ پر عمل در آمد کے سلسلے میں ضروری اقدام کریں گی اور کوئی ایسا اقدام نہیں کریں گی اور اس کی اجازت دیں گی جس سے معاہدہ پر عمل در آمد میں رکاوٹ پیدا ہو۔

شیفول الف

سریم عمل در آمد کو نسل

(۱) سوائے اس امر کے جو آئین کے منافی ہو پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان قومی اتحاد کے

درمیان طے پانے والے سمجھوتے پر پوری طرح عمل درآمد کے لئے ایک سپریم عمل درآمد کو نسل قائم کی جائے گی (جسے بعد ازاں کو نسل کما جائے گا)

(۲) کو نسل کی ہیئت ترکیبی یہ ہوگی۔

(i) پاکستان پیپلز پارٹی پانچ ارکان نامزد کرے گی۔

(ii) پاکستان قومی اتحاد پانچ ارکان نامزد کرے گا۔

(۳) کو نسل کو عمل اختیار ہو گا کہ اس کا کوئی رکن کوئی حوالہ پیش کرے یا یہ خود تحریک

کرے یا کوئی شکایت موصول ہو تو یہ مسئلہ پر جس کا تعلق سمجھوتے پر عمل درآمد یا کسی خلاف ورزی سے ہو فوراً کر کے فیصلہ صادر کرے۔

(۴) کو نسل کے فیصلے متفقہ ہوں گے اختلاف کی صورت میں مسئلہ خود بخود سپریم کورٹ کو

چلا جائے گا۔

(۵) متعلقہ مسئلہ سپریم کورٹ کے تین سب سے سینئر ججوں کے سامنے پیش ہو گا اور وہ عمل

درآمد کو نسل کے تمام ارکان کو نوٹس جاری کر کے اور بند کرے میں کو نسل کے ساتھ یا حاضر ارکان کی موجودگی میں مسئلہ پر غور کر کے ۷۲ گھنٹوں کے اندر اکثریت رائے سے فیصلہ صادر کریں گے۔ سپریم

کورٹ کا یہ فیصلہ کو نسل کا فیصلہ مستحضر ہو گا۔

(۶) کو نسل حسب ضرورت اجلاس کرے گی لیکن بیٹھے میں ایک اجلاس لازمی ہو گا جو ہفت

کے پہلے پورے کار کو ہو گا اور اس وقت تک جاری رہے گا جب تک درپیش کام نہ ختم نہ جائے۔

(۷) کو نسل کے اجلاس کے لئے کورم سات (۷) کا ہو گا اور اگر کورم نہ ہونے کی

صورت میں اجلاس نہ ہو یا ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ مسئلہ سپریم کورٹ کے پاس چلا گیا ہے اور اس کا فیصلہ سپریم کورٹ مذکورہ بالا طریق پر کرے گا۔

(۸) وفاقی اور صوبائی حکومتیں کو نسل کے فیصلوں پر فوراً عمل کریں گی اور اس فیصلے کی

پابندی ان تمام آئینی اور انتظامی حکام پر لازمی ہوگی جو وفاق یا صوبوں کے سلسلہ میں کسی قسم کے فرائض ادا کر رہے ہوں گے بشمول مسلح افواج، محکمہ متنی کارپوریشنوں سرکاری ذرائع ابلاغ کے اور متعلقہ افراد، حکام

اور اہلکاروں کا فرض ہو گا کہ وہ کو نسل کے فیصلوں اور ہدایات پر عمل کریں۔

(۹) کو نسل کو اپنے طریق کار کے متعلق ضوابط بنانے اپنی کارروائی کو منضبط کرنے اور

کیسیاں تشکیل کرنے کا اختیار ہو گا۔

(۱۰) وفاقی حکومت وہ تمام سولتیس فراہم کرے گی جو کو نسل اور اس کے ارکان کے خیال

میں ضروری ہوں گی اور مصارف و فرائض سے پورے ہوں گے۔

مذکورہ بالا کو آئین پاکستان میں عارضی ترمیم کے طور پر بطور دفعہ ۱۱۵ الف شامل کیا جائیگا اور وزیر اعظم کے انتخاب کے بعد یہ حصہ آئین کا حصہ نہیں رہے گا۔

شیڈول 'ب'

ترمیم نمبر	ش	ترمیم نمبر
۸	۳	۱
۶۱	۵	۱
۱۲۷	۷	۱
۱۹۳	۸	۱
۱۹۹	۹	۱
۲۰۰	۱۰	۱
۲۱۲	۱۲	۱
۱۰	۲	۳
۲۳۲	۳	۳
۵۳	۲	۳
۱۹۹	۸	۴
۱۰۱	۲	۵
۱۷۹	۵	۵
۱۸۰	۶	۵
۱۸۷	۷	۵
۱۹۵	۹	۵
۱۹۶	۱۰	۵
۱۹۹	۱۱	۵
۲۰۰	۱۲	۵
۲۰۶	۱۳	۵
۲۸۰	۱۷	۵
۱۷۹	۲	۶
۱۹۵	۳	۶
۹۶-الف	۲	۷
۱۰۱	۳	۷
۲۳۵	۴	۷

کے علاوہ ہوں گے جو عام عدالتوں کو پہلے ہی حاصل ہیں۔

۸..... مزید تجویز کیا جاتا ہے کہ منصفانہ عادلانہ اور منصف ستمبر انتخابات کروانے اور کسی قسم کی بد عنوانیوں، جاننا اثر و رسوخ کے زیر اثر شہوت اور ایکٹ کن دفعات اور قواعد کی خلاف ورزی کو روکنے کے لئے کمیشن کو کسی شخص کے خلاف استغاثی یا استحقاقی حکم یا ترقی کا حکم اور ایسے ہی دوسرے احکام جاری کرنے کا اختیار دینے کے لئے باب ۱۰۳ کے ساتھ مزید ذیلی باب شامل کیا جائے۔

۹..... یہ ممکن بنانے کے لئے کہ انتخابی تہذیب کا عدنان ریڈنگ افسر کے بجائے صرف ایکشن کمیشن کو ہاؤس کوئی شخص یا ادارہ کمیشن کی طرف سے قضیہ برائیت کے نتیجے تک کے بارے میں کوئی اعلان نہیں کیا جائے گا۔ ایکٹ کے باب ۲ میں ترامیم کی جانی چاہئے۔

۱۰..... ایکٹ کے باب ۸۵ میں ترامیم کی جانی چاہئے تاکہ کسی ووٹر کو انتخابی امیدوار کے نشان یا نام یا ووٹر کے نام کو دست اور جائے رہائش کے حامل کسی کا تھکا کے اجراء کو ممنوع قرار دیا جائے۔

۱۱..... نیٹیفکیشن یا کسی اور طریقہ کی ہونے والی منتقلیوں میں مداخلت کے لئے "وائٹ پیپر" یا کسی قسم کے ایکٹیوٹک آلات کے استعمال کو برقرار رکھا جائے اور کمیشن کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ جانے والے نیٹیفکیشن کو بحال کرنے کا حکم دے سکے۔

۱۲..... پاکستان قومی اتحاد نے منصفانہ عادلانہ اور منصف ستمبر انتخابات کے انعقاد کے سلسلہ میں تجویز دینے کے لئے گزشتہ انتخابات کے دوران جو بد عنوانیاں سامنے آئی تھیں ان کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی۔ کمیٹی کی پیش کردہ رپورٹ شرمناک ہے۔ رپورٹ کی سفارشات کو قانون و ضوابط کا حصہ بنایا جانا چاہئے۔

۱۳..... پت چلا ہے کہ موجودہ چیف الیکشن کمشنر نے حالیہ انتخابات کے حوالہ سے حکومت کو حال ہی میں ایک رپورٹ پیش کی ہے جس میں انہوں نے منصفانہ انتخابات کو یقینی بنانے کے لئے کی ترامیم تجویز کی ہیں۔ اس رپورٹ کی ایک نقل پاکستان قومی اتحاد کو فراہم کی جانی چاہئے جو اس رپورٹ پر تبصرہ کرے گا۔

۱۴..... یہ بھی ضروری ہے کہ سنی چیف الیکشن کمشنر سے کہا جائے کہ وہ موجودہ انتخابی قوانین کا جائزہ لیں اور منصفانہ عادلانہ اور منصف ستمبر انتخابات کو یقینی بنانے اور بد عنوانیوں کے خاتمہ کے لئے ان کی تجاویز حاصل کی جائیں اور نئے چیف الیکشن کمشنر کی سفارشات کو قوانین و قواعد کی صورت دی جائے۔

مطالبات کی اس قدر طویل فہرست دیکھ کر وزیر اعظم لاہی پریشان ہو گئے تھے چنانچہ انہوں نے جمعرات ۵ مئی کو اس مسودے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ..... مطالبات کی اس طویل فہرست سے صورت حال پیچیدہ ہو گئی ہے، قومی اتحاد کو صرف بنیادی مطالبات پیش کرنے چاہئیں۔

وزیر اعظم بھٹو کے اس تبصرے کا جواب پیرکارانے اسی روز ان الفاظ میں دیا۔

"اگر پی۔ این۔ اے کا یہ مسودہ مصلحت کے لئے منظور ہے تو سمجھو۔ سمجھو۔ ہو سکتا ہے اور سمجھوتے کے بعد سات دن کے اندر اندر اسمبلیاں توڑ دی جائیں جس کے ۳۰ دن بعد انتخابات کرانا ہوں گے۔" یہ صورت حال انتہائی پریشان کن تھی پی۔ این۔ اے کا مسودہ ایسا نہیں تھا جس پر جگت میں کوئی

۱..... دفعہ ۱۸۱ کی شق (۲) کی ذیلی شق (ب) میں لفظ "وو" کو "چار" سے بدلنے کے لئے ترامیم کی جانی چاہئے

۲..... دفعہ ۲۲۱ میں یہ شامل کیا جائے گا کہ کمیشن کو پاکستان کے تمام ملازمین کی خدمات حاصل کرنے کا اختیار حاصل ہو گا اور عوامی نمائندگی کے ایکٹ مجریہ ۱۹۷۶ء میں مناسب ترامیم کے ذریعے یہ شامل کیا جائے گا کہ۔

پاکستان کے ملازمین میں یونیورسٹیوں، بلدیات، سرکاری کارپوریشنوں، نمبر خود مختار کارپوریشنوں، حکومت کے زیر انتظام اداروں اور صنعتوں اور مسیح انجارج کے ملازمین شامل ہیں۔

۳..... عوامی نمائندگی کے ایکٹ کے باب ۵ میں اس مفہوم کا حاصل ذیلی باب (۳) شامل کرنے کے لئے ترامیم کی جائے گی کہ کمیشن کو ذیلی باب (۲) کے تحت فرائض کی ادائیگی کو کسی شخص کی ضرورت ہوگی تو وہ شخص فوری طور پر کمیشن کی ہدایات کا پابند ہوگا۔ جسے ان اشخاص کے سلسلہ میں تمام انضباطی اقدامات کرنے کا مکمل اختیار ہو گا جن میں انضباطی کارروائی، عہدہ میں کمی یا ملازمت سے برخاستگی اور اگر وہ کمیشن کے خیال میں کمیشن کے احکام اور ہدایات کی پابندی کرنے میں ناکام رہے ہیں یا وہ انتخابات سے متعلق اپنے فرائض کے سلسلہ میں بد عنوانی یا حکم عدولی کے مرتکب پائے گئے ہیں تو ان افراد کو ان افراد کے اپنے حکموں کی شرائط ملازمت سے قطع نظر انہیں سزا دینے کا اختیار ہو گا اور وہ صرف مکمل ایکشن کمیشن کے رپورٹ ہی اپیل کر سکیں گے۔

۴..... عوامی نمائندگی کے ایکٹ میں ایکشن کمیشن کو یہ اختیار دینے کے لئے باب ۶۳۔ اسے شامل کیا جائے گا کہ کمیشن کو پریزیڈنٹنگ پارٹیزنگ آفیسر، جیسی بھی صورت ہو..... کی ووٹوں کی گنتی کے خلاف اپیل کی سماعت کا حق ہو گا اور آئین کی دفعہ ۲۲۵ میں موزوں ترامیم کی جائے گی۔

۵..... ایکشن کمیشن کی طرف سے دفاعی و صوبائی حکومتوں کے تمام انتظامی اداروں اور حکومت پاکستان، حکومت کے زیر انتظام اداروں اور کارپوریشنوں کے زیر ملازمت اشخاص کے بارے میں استحقاقی یا استغاثی احکامات جاری کرنے کے اختیارات دینے کے لئے عوامی نمائندگی کے ایکٹ میں نیازی ذیلی باب ۱۰۳ شامل کیا جائے گا۔

۶..... یہ بھی تجویز کیا جاتا ہے کہ کمیشن کو یہ اختیار دینے کے لئے کہ وہ یہ امر یقینی بنا سکے کہ پاکستان فی وی، پاکستان براؤ کاسٹنگ کارپوریشن اور نیٹیل ریڈنگ ٹرسٹ کے اخبارات اپوزیشن کے ساتھ خبروں اور خیالات کی تشہیر کے معاملہ میں مساویانہ اور غیر جانبدارانہ سلوک کر رہے ہیں۔ باب ۱۰۳ کے ساتھ ایک ذیلی باب کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

۷..... مزید تجویز کیا جاتا ہے کہ ایکشن کمیشن کو کسی حقیقی امیدوار یا اس کے کارکنوں کے تحفظ کے لئے ان کی صفات اور استحقاقی یا استغاثی احکامات جاری کرنے کے سلسلہ میں بانی کورٹ کے اختیارات دینے کے لئے باب ۱۰۳ میں ایک ذیلی باب کا اضافہ کیا جائے۔ ان اختیارات کو انتخابات کے نوٹی فیکیشن کے اجراء کی تاریخ سے لے کر تاریخ کا اعلان کے دس روز بعد تک استعمال کیا جاسکے گا اور یہ اختیارات ان اختیارات

بھٹو صاحب سہ ماہی ریٹ ہاؤس میں

قومی اتحاد کی تحریک کے اوائل ہی میں نے وزیر اعظم سے گزارش کی تھی کہ انتخابات میں بے قاعدگیوں کے خلاف شروع ہونے والا ایجنڈا اب ایک مذہبی تحریک میں تبدیل ہو رہا ہے اور جس تحریک میں مذہب کا عنصر شامل ہو جائے اس میں لوگ بے دریغ جانوں کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف پی۔ این۔ اے کی سیاسی جدوجہد بہ تمام و کمال نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے مطالبہ میں بدل رہی تھی۔ وزیر اعظم نے اس رنگ کو محسوس کرتے ہوئے ۵ اپریل ۱۹۷۷ء کو مجھے ایک مکتوب ارسال کیا ہمارے اور وزیر اعظم کے درمیان سے بیورو کرہی کے پردے اب ہٹ چکے تھے ان کا انداز مخاطب ایک مرتبہ پھر ان کا اپنا ہن چکا تھا وزیر اعظم کا مکتوب سامنے کے صفات پر ملاحظہ ہو

بد قسمتی سے وزیر اعظم اب بھی اس معاملے کو محض ”مولویالوجی“ کا ایک مسئلہ سمجھ رہے تھے اور مخالف مولویوں کے مقابل حامی مولویوں کی ایک قوت کھڑی کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے خود ہی اوقاف و مرکز کی تحویل میں دینے سے سلسلہ گریز کیا تھا اور اب تحریک کی شدت کو دیکھتے ہوئے وہ اس کے خواہاں تھے کہ میں صوبائی وزراء اور اوقاف و علم پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کر کے مولوی حضرات کو حکومت کے حق میں ہموار کروں۔ وزیر اعظم کی سمجھ میں وہ نکتہ بہت دیر بعد آیا کہ جس کی طرف میں ابتدا ہی سے اشارہ کر رہا تھا، ۱ اپریل کو جب وزیر اعظم اور میں لاہور میں تھے تو میں نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ فوری طور پر ایک پریس کانفرنس کا اہتمام کریں اور ”نظام مصطفیٰ“ کے نفاذ کے سلسلے میں بعض ٹھوس اقدامات کا اعلان کر دیں انہوں نے حکم دیا کہ میں اس کے لئے ان کی پریس کانفرنس کے نکات تحریر کر کے انہیں دے دوں۔ چنانچہ میں نے اسی روز وہ نکات ان کے حوالے کر دیئے۔ (مکتوب کا اصل متن اور وزیر اعظم کا نوٹ ملاحظہ ہو)

○ ○ ○

فیصلہ کیا جاسکتا اس پر بے حد غور و خوض کی ضرورت تھی اور وقت بھی ور کار تھا۔ وزیر اعظم بھٹو نے طے کیا کہ ۱۰ مئی کو پیپلز پارٹی کی پارلیمانی پارٹی کا اجلاس بلا یا جائے گا جس میں اس مسودہ پر غور کیا جائے گا۔ ادھر بیرو صاحب پگارا، سردار سکندر حیات اور ابو سعید انور کے خلاف ڈی۔ پی۔ آر کے ماتحت مقدمات درج کر کے انکی گرفتاریوں کے لئے پولیس نے چھاپے مارنے شروع کر دیئے اور لاہور میں دوبارہ کرفیو نافذ کر دیا گیا۔

اسی شام کا ایک اور اہم واقعہ تھا کہ ملک غلام مصطفیٰ کھر اسلام آباد پہنچے اور انہوں نے سخت بحران کے اس دور میں اپنے سابق دوست اور قائد و الفقار علی بھٹو کو پھنسنے ہوئے دیکھ کر دوبارہ اپنی خدمات انہیں پیش کر دیں۔ یہ ان کا رضا کارانہ فیصلہ تھا اور وہ لاہور سے اپنی سفید مرسیڈیز خود چلاتے ہوئے اسلام آباد پہنچے تھے۔ کھر بے حد جذباتی ہو رہے تھے۔ وہ وزیر اعظم کے خلاف بیرونی طاقتوں کی سازشیں برواشت نہ کر سکے تھے۔ تجدید تعلق کا یہ منظر عجیب تھا بیشتر دوستوں کی آنکھیں اس موقع پر نم تھیں۔

○ ○ ○ ○



وزیر اعظم پاکستان
راولپنڈی

مافی ذیل مضامین

میں قومی اتحاد کی تحریک میں اہم کردار ادا کر رہا ہے اور محکمہ اوقاف کے ملازمین سمیت آمدنیوں پر ان کا سب سے زیادہ ٹکس ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اوقاف کے ملازم مولویوں کو قومی اتحاد سے الگ کر کے مولویوں کی مزاحمتی قوت کو حکومت کے حق میں متحرک کر دیا جائے۔ ان کی اہم مولوی اور دینی رہنما جنہوں نے گذشتہ انتخابات کے دوران ہماری حمایت کی تھی انہیں منظر میں غائب ہو چکے ہیں۔ انہیں دوبارہ سامنے لانا ہو گا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے کہ وہ ایک بار پھر ہماری ہی طرح حمایت کریں جس طرح انہوں نے انتخابات کے دوران کی تھی۔ اس کام میں آپ کو صوبائی حکومتوں کی مکمل حمایت اور تعاون کی ضرورت ہوگی لہذا آپ کو اپنی سربراہی میں ایک ایسی کمیٹی تشکیل دینی چاہئے جس میں اوقاف کے تمام صوبائی وزراء شامل ہوں۔ آپ کو ان کے ساتھ وقتاً فوقتاً ملاقاتوں کے بعد ایک لائحہ عمل تیار کر کے اس پر فوری طور پر عمل درآمد شروع کر دینا چاہئے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس سلسلہ جو اقدام بھی کریں گے اور اس سے جو بھی کامیابی حاصل ہو مجھے اس سے مطلع کرتے رہیں گے۔

رحمہ (ذوالفقار علی بھٹو)
ڈائریٹریل ۱۹۷۷ء

مولانا کوثر نیازی
وزیر برائے مذہبی امور
اسلام آباد۔



حکومت پاکستان
وزارت برائے مذہبی و اوقاف امور و مسند پر پاکستانی

مہمان = وزیر اعظم کی مختلف مساجد کے علماء و مشائخ کے سے ملاقات کے بارے میں تجویز

جناب وزیر اعظم کو پشاور میں حزب اختلاف کی تحریک میں حصہ لینے والے علماء سے سیری بات چیت یاد ہوگی۔

میں نے جناب وزیر اعظم سے یہ گزارش کی تھی کہ حزب اختلاف میں شامل بعض اہم صوبائی شہر پسندانہ گمراہ کامیاب کوششوں کے باعث حکومت کے خلاف تحریک مذہبی جنگ کا سارنگ اختیار کر گئی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ایسے ماہرین و علما بھی جن کے کوئی سیاسی متصد نہیں ہیں اس تحریک میں شامل ہونے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

سیاسی سوچ بچار رکھنے والے شہرینہ جانیدار، اہم سمیت ان علماء کو تحریک سے الگ کرنے کیلئے میں یہ تجویز کروں گا کہ جناب وزیر اعظم براہ کرم ملک بھر سے منتخب کردہ قریباً ایک سو ایسے علماء اور مشائخ سے ملاقات کرنا پسند فرمائیں گے جن کو لائل سے متاثر کیا جاسکتا ہے اور جن کے مذہبی جوش و جذبات کی بنیاد پر جناب وزیر اعظم کو کچھ مخصوص تجاویز مل سکیں۔ ان کا اعلان کر کے انہیں شہرہ آفاق کر سکتے ہیں۔

مندرجہ بالا مقصد کے حصول کیلئے میں جناب وزیر اعظم کی توجہ کیلئے یہ تجویز پیش کرنا چاہوں گا کہ وہ علماء اور مشائخ سے اپنی ملاقات میں درج ذیل اہم نکات کو مدنظر رکھنا پسند فرمائیں گے۔

(۱)۔ اپنی حکومت کی اسلامی پالیسیوں اور کارکنانوں کی مطابقت اور تسلسل میں جناب وزیر اعظم ایسی سرگرمیوں پر فوری طور پر پابندی لگانے کی پیشکش کریں جن کی تمام علماء اور پاکستانی عوام کا اکثریتی حصہ متفقہ طور پر مذمت کرتا ہے اور جن کی وجہ سے اسلامی جمہوریہ پاکستان کو تہمت کا نشان بنایا جاتا

ہے۔ ان سرگرمیوں میں شراب کا استعمال اور قدر بازاری (گھوڑ دوڑ اور اس کی دوسری صورتیں) شامل ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں اگر یہ کام سر کیا جائے تو صرف یہی واحد عمل مندرجہ بالا مقصد کو مانا اور مشکل کو حزب مخالف کی تحریک سے الگ کرنے کیلئے کافی ہو گا اور ہو سکتا ہے اس اقدام کے باعث انہیں ایسے بیانات جاری کرنے کی اگلی گھنٹت ملے جس سے انہیں پیش کرنے والوں کی قوت کمزور پڑ جائے اور اس کا عوام پر بھی بلاشبہ شاندار اثر مرتب ہو گا۔

(۲)۔ حزب اختلاف کے خلاف شہریت کے بنیادی مطالبہ کے سلسلہ میں جناب وزیر اعظم

اسلامی نظریہ کی کونسل کی تشکیل کے ارکان کی نامزدگی کے فیصلہ کا اعلان بھی کر سکتے ہیں اور اگر علماء یہ

معموس کریں تو نسل میں مولانا مودودی اور مولانا شاہ احمد نورانی کی شمولیت یا پھر اس کے متبادل کے طور پر جناب وزیر اعظم نفاذ شریعت کیلئے طریق کار کی چیماہ کے دوران سفارش کرنے کیلئے ایک کمیشن کی تشکیل کا اعلان بھی کر سکتے ہیں۔ اس اقدام سے حزب اختلاف کے اس پروپیگنڈے کے غبارے سے ہوا خارج ہو جائے گی جس نے ان علماء کو بھی بھرا کھاسے جو اپنے طور پر اسے پسند لوگ ہیں۔

وزارت کے پاس علماء اور مشائخ کی ایسی فرست پیلے ہی سے موجود ہے جو اوقاف کے صوبائی محکموں کی سفارشات کی بنیاد پر تیار کی گئی ہے اور جو نبی جناب وزیر اعظم نے اپنی شمولیت کے پیش نظر اس اجلاس کی تاریخ اور وقت مقرر فرمایا دعوت نامے جاری کر دیئے جائیں گے۔

دعوت (کوثر نیازی)

میں ان سے بالکل مل سکتا ہوں، لیکن یہ اہم تجاویز کا بیڑہ کے آئندہ اجلاس میں پیش کی جانی چاہیں۔

دعوت (وزیر اعظم)

۸-۴-۷۷

وزیر برائے مذہبی امور۔



بسم اللہ الرحمن الرحیم

وزیر برائے مذہبی امور
حکومت پاکستان
کیمپ لاہور
۱۷ اپریل ۱۹۷۷ء

وزیر اعظم کی خواہش کے مطابق میں ”نظام مصطفیٰ“ کے نفاذ کے سلسلہ میں ان کی پریس کانفرنس کیلئے درج ذیل نکات پیش کرتا ہوں۔

میں اس بات پر زور دینے کی اجازت چاہتا ہوں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے عزم کا اعلان کرنے سے قبل وزیر اعظم کو اس امر کو یقینی بنانا چاہئے کہ یہ اعلان صرف وقت حاصل کرنے کا آلہ یا سیاسی چال ثابت نہ ہو۔ اگر بد قسمتی سے عوام نے یہ اثر لیا تو مجھے ڈر ہے کہ یہ سارا عمل الٹ بھی پڑ سکتا ہے۔

قومی اتحاد، پاکستان پیپلز پارٹی کے خلوص اور وزیر اعظم کی طرف سے صحیح اسلامی نظام کے نفاذ کے بارے میں بہر حال قلمک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کرے گا، لہذا میں وزیر اعظم کے اعلان کے بعد ان کی اجازت سے تمام صوبوں کے معروف علماء اور مشائخ سے ضلع وار اجلاسوں اور چارڈیکھیل کا سلسلہ شروع کروں گا۔ ان میں حزب اختلاف سے متعلق علماء و مشائخ بھی شامل ہوں گے۔

آخر میں پر زور طور پر میں یہ عرض کروں گا کہ وزیر اعظم اپنے اعلان کے ذریعے عام لوگوں اور خصوصاً حزب اختلاف کیلئے جو بھی سیاسی پیشرفت بھی کرنے کی نیت رکھتے ہیں وہ اس وقت تک مصلحہ بہ حد تک مؤثر نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خصوصی اہمیت کا حامل نہ ہو۔

دعوت (کوثر نیازی)

یہ سیاسی کام آپ کو دوسرے وزراء اور پارٹی لیڈروں کو کرنا ہو گا۔ میں تمام محاذوں پر توجہ نہیں دے سکتا۔

دعوت (وزیر اعظم)

اصل متن کیلئے لاکھ ہو میر جات

میں نے ان سے گزارش کی تھی کہ وہ پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا اعلان کریں اور اس کی یقین دہانی کرائیں کہ اس طرح نہ تو وہ کسی کو سیاسی جھانسدے رہے ہیں نہ وقت گزاری کے لئے ایسا کر رہے ہیں۔ ان پر واضح کیا اگر خدا نخواستہ ایسا تاثر مرتب ہو گیا تو اس کے بدترین نتائج برآمد ہوں گے۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ پی۔ این۔ اے اس سلسلے میں ان کے خلوص نیت کو مشکوک بنانے کی بھرپور کوشش کرے گی چنانچہ میں وزیر اعظم کے اعلان کے بعد ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے بلا تخصیص تمام علماء و مشائخ سے تبادلہ خیال کروا کر جن میں حزب اختلاف کے علماء بھی شامل ہوں گے۔

اس سے قبل ۸ اپریل کو بھی وزیر اعظم کے نام ایک مکتوب میں 'میں نے کوشش کی تھی کہ علماء مشائخ کے ساتھ ان کی ایک ملاقات کا اہتمام کر سکوں۔ دراصل وزیر اعظم، جن کو وزیر داخلہ خان عبدالقیوم خان نے یہ تاثر دیا تھا کہ صوبہ سرحد کے علماء کرام تشویش ناک حد تک حکومت کے مخالف ہو چکے ہیں جن کا سدباب ضروری ہے' چنانچہ وزیر اعظم کے حکم پر چند صورت حال کا جائزہ لینے صوبہ سرحد کے دورے پر گیا۔ اور وہاں مختلف مکاتب فکر کے علماء سے تفصیلی تبادلہ خیال کے علاوہ کئی جلسوں سے بھی خطاب کیا۔ واپسی پر میں نے وزیر اعظم کو جو رپورٹ پیش کی اس میں انہیں یہ سمجھانے کی بھرپور کوشش کی تھی کہ ایسی ٹیشن اب مذہبی رنگ پڑ چکا ہے اور اس میں وہ علماء بھی شامل ہو چکے ہیں جن کی سیاست سے کوئی واسطہ کبھی نہیں رہا۔ میں نے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ملک بھر سے منتخب ایسے ایک سو علماء و مشائخ سے وہ ملاقات کریں اور ان کی تجاویز پر عمل کرتے ہوئے اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں اپنے فیصلے کا اعلان کر دیں۔ فوری نوعیت کے اقدامات کے طور پر میں نے مشورہ دیا تھا کہ شراب اور جوئے پر پابندی عائد کر دی جائے جس کے نتیجے میں سیاست سے لاتعلق علماء تحریک سے علیحدگی اختیار کر لیں گے۔ مزید برآں اس سلسلے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل نو اور اس میں مولانا مودودی اور مولانا شاہ احمد نورانی کی شمولیت کی تجویز کے ساتھ چھ ماہ کے اندر شرعی قوانین کے مکمل نفاذ کی ضرورت پر زور دیا۔ میں نے ان کو بتایا تھا کہ یہ اقدامات اپوزیشن کے غبارے میں سے ہوا نکال دیں گے اور اس سلسلے میں وزارت مذہبی امور کی جانب سے علماء کے ناموں اور دیگر اقدامات سے آگاہ کرتے ہوئے میں نے ان سے اجازت طلب کی تھی کہ وہ مجھے علماء سے اپنی ملاقات کا پروگرام طے کرنے دیں وزیر اعظم نے میرے اس تفصیلی مکتوب پر نوٹ لکھ کر میں علماء سے ملنے کے لئے تیار ہوں لیکن یہ اچھی تجاویز کابینہ کے اجلاس میں پیش کی جائیں۔ اس مقصد کے لئے میری ہدایت پر وزارت مذہبی امور کے سیکرٹری نے کابینہ کے غور و خوض کے لئے ایک تفصیلی نوٹ تیار کیا۔ میں خلوص دل سے یہ سمجھتا تھا کہ ملک میں اسلام کے نفاذ کا یہ سب سے بہترین موقع ہے جو اگر ہاتھ سے نکل گیا تو برصغیر کے مسلمانوں کے اس قدیم خواب کی تعبیر پھر شاید ہی کبھی نکل سکے، وزیر اعظم، جن کو اگر چاہتے ہوں وقت ملک میں اسلامی قوانین نافذ کر سکتے تھے جس کے بعد کسی شخص کو نہ تو اسلام کے نام پر کوئی تحریک چلانے کی ضرورت محسوس ہوتی اور نہ اسلام کا نام لے کر کوئی طالع آزمایہ عوام

کے مذہبی جذبات کا استحصال کر سکتا، یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے اسی وقت طے ہو جاتا..... لیکن افسوس کہ قسمت میں ایسا نہ تھلیری تجاویز پر وزیر اعظم نے فیصلہ کس انداز میں سوچنے کے لئے اتنی تاخیر کر دی کہ وقت کی باگ ڈور خود ان کے ہاتھ سے نکل گئی بل پرل کے آغاز میں پیش کی گئی تجاویز پر انہوں نے سٹی میں فیصلے کے لاہور گورنر ہاؤس میں منعقدہ ایک پریس کانفرنس کے ذریعے انہوں نے شراب اور جوئے پر پابندی کا اعلان کیا تو پی۔ بی۔ نے مختصر اعلان کی پریس کانفرنس کی خبر دینے کے بعد آخری سطر جو نشر کی وہ یہ تھی..... "جب مسز بھٹو شراب پر پابندی کا اعلان کر رہے تھے۔ تو وہ سگار پی رہے تھے۔" صرف اس ایک جملے کے ذریعے پی۔ بی۔ نے وزیر اعظم کے ان اقدامات کو مشکوک بنا کر رکھ دیا تھا۔ عام آدمی یہ سمجھا کہ "سگار" بھی غالباً شراب ہی کی طرح کی کوئی چیز ہے جسے مسز بھٹو شراب پر پابندی کے بن کے وقت بھی پی رہے تھے۔" سولوی صاحبان نے خود مجھ سے دریافت کیا..... "ہم صحیح طور پر نہیں سمجھ سکے تھے، آپ بتائیں مسز بھٹو اس وقت کیا پی رہے تھے؟" یہ نظام مصطفیٰ کے نفاذ کی تحریک میں شریک لوگوں کی سادہ لوحی کا عالم جسے بیرونی طاقتیں بھرپور طریقے سے ایکس پلائٹ کر رہی تھیں۔

۷ مئی کو اس سلیکٹ کمیٹی کا اجلاس ہوا جو میری سربراہی میں قومی اسمبلی میں قائم ہوئی تھی۔ کمیٹی کے ذمے یہ کام لگایا گیا تھا کہ شراب اور جوئے پر پابندی کو عمل کی شکل میں اسمبلی میں پیش کرے۔ کمیٹی کے اراکین میں وزیر خزانہ عبدالحفیظ بیززادہ، وزیر قانون ایس۔ ایم۔ مسعود، وزیر زراعت شیخ محمد رشید، وزیر صنعت حادر رضا گیلانی، میر افضل خان، صاحب زادہ نذیر سلطان، علی اصغر شاہ اور ملک سکندر خان شامل تھے۔ کمیٹی نے طے کیا کہ مجوزہ بل منگل کو قومی اسمبلی میں پیش کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ۱۰ مئی منگل کے روز میں نے قومی اسمبلی میں شراب اور جوئے پر پابندی کا بل پیش کیا جسے منظور کر کے قانونی شکل دے دی گئی، مزید برآں جمعہ کو ہفتہ وار تعطیل قرار دینے کا بل بھی پیش کر کے اسمبلی سے منظور لے لی گئی۔ جمعرات ۱۲ مئی کو سینٹ نے بھی مذکورہ بالا دونوں بل پاس کر دیئے اور اس طرح ہم "کانزوں" کے ہاتھوں ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کی سمت وہ قدم اٹھائے گئے جن کی جرات نہ پہلے کسی نے کی تھی نہ ان

میں اضافہ بعد میں کسی "مرد سو من" کو نصیب ہوا..... ہاٹ کر نام مقصود تھا کہ قومی اتحاد کی جماعتیں یہ ذکر بر سبیل تذکرہ نکل آیا جس سے فقط یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ قومی اتحاد کی جماعتیں شرعی قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں مخلص نہ تھیں۔ اگر ہوتیں تو مسز بھٹو کے اقتدار کے خاتمہ کی جدوجہد کرنے کی بجائے اس وقت خود ان کے ہاتھوں ملک میں مکمل اسلامی قوانین کا نفاذ کرا سکتی تھیں، لیکن ان کا ہدف ہی اور تھا..... نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے نقطہ نعرے تھے جن کا مفہوم شاید خود اس کے بیشتر رہنماؤں پر واضح نہ تھا۔ وزیر اعظم نے سعودی عرب کے سفیر شیخ ریاض اٹھیب کے ذریعے

سالہ میں نظر بند پی۔ این۔ اے کے رہنماؤں کو پیغام بھجوایا کہ وہ اپنے طویل مطالبات پر مبنی سودے

پر پہلے وزارتی سطح پر بات چیت کر کے کوئی متفقہ فارمولا طے کر لیں۔ اس سلسلے میں سینیٹ کے ممبران، مصلحتاً سب سے ۶ مئی کو قومی اتحاد کے رہنماؤں سے ملاقات کی جس میں انہیں شاہ خالد مرحوم اور شزاوہ نند کی مفاہمت کی خواہشات سے بھی آگاہ کیا لیکن اتحاد کی طرف سے پیر صاحب پکارا شریف نے آٹھ صفحات پر مشتمل ایک دستاویز جاری کر دی اور اعلان کیا کہ ہم وزارتی سطح پر بات چیت نہیں کریں گے۔ اگلے روز مفتی محمود سے سی۔ ایم۔ ایچ میں سعودی سفیر کے علاوہ لیبیا کے سفیر نے بھی ملاقات کر کے انہیں مفاہمت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ ادھر مسز بھٹو کا اصرار تھا کہ اپوزیشن صرف بنیادی مطالبات پیش کرے! اس طویل مسودے پر بات نہیں ہو سکتی جو اس نے پیش کر دیا ہے۔ ریاض الخلیب نے اس امر پر قومی اتحاد کے رہنماؤں کو آمادہ کرنے کے لئے ۸ مئی کو پھر ان سے سالہ میں ملاقات کی جس کے جواب میں پیر صاحب پکارا نے کہا کہ ہمارے مطالبات بنیادی طور پر پانچ (۵) ہیں باقی تو ان کی تشریحات ہیں۔ وزیر اعظم بھٹو ۹ مئی کو کراچی چلے گئے اور ہمیں ہدایت دے گئے کہ اگر پی۔ این۔ اے والے راضی ہوں تو آپ لوگ سلسلہ جنجانی کر سکتے ہیں لیکن قومی اتحاد کے رہنما وزیر اعظم سے کم سطح پر گفتگو کرنے کے لئے آمادہ نہ تھے اور شیخ ریاض الخلیب نے اس سلسلے میں ان کے حتمی فیصلے سے وزیر اعظم کو آگاہ کر دیا۔ مسز بھٹو ۱۱ مئی کو واپس اسلام آباد پہنچے اور انہوں نے اعلان کیا کہ وہ قومی اتحاد سے براہ راست مذاکرات کے لئے تیار ہیں لیکن مجھے نہیں پتہ کہ مذاکرات کی ناکامی کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ اسی روز ہینڈل پارٹی کے پارلیمانی گروپ کا اجلاس ہوا جس میں وزیر اعظم بھٹو کو قومی اتحاد کے ساتھ مذاکرات کا اختیار دیا گیا۔ شام تین بجے پی۔ ایم۔ ہاؤس میں وزیر اعظم بھٹو کی صدارت میں کابینہ کا ایک اہم اجلاس ہوا جس میں میرے علاوہ حفیظ پیرزادہ، حامد رضا گیلانی، عزیز احمد، میر افضل اور نثار خان کے علاوہ چند اور وزرائے شریک ہوئے۔ رات ۸ بجے تک ہم لوگ پی۔ این۔ اے کے ساتھ باقاعدہ مذاکرات کی حکمت عملی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے رہے جس کے بعد اجلاس ختم ہو گیا اور ہم لوگ گھروں کو روانہ ہو گئے۔

رات کے تقریباً ساڑھے نو بجے بھٹو نے جب وزیر اعظم کے اے۔ ڈی۔ سی کانون آیا جنہوں نے مجھے فرمایا۔ ایم ہاؤس بلوایا تھا۔ جب میں پہنچا تو دیکھا کہ لان میں بڑی کرسیوں پر حفیظ پیرزادہ اور میر افضل خان پہلے سے بیٹھے تھے۔ ابھی میں بیٹھا ہی تھا کہ وزیر اعظم بھٹو تشریف لے آئے اور بولے..... چلے ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ منزل کا علم کسی کو بھی نہ تھا نہ اس سلسلے میں اجلاس میں کوئی بات ہوئی تھی وزیر اعظم اور ہم لوگ گاڑی میں بیٹھ چکے تو چاکر وزیر اعظم کے ملٹری سیکرٹری میجر جنرل امتیاز بھی اگلی نشست کا دروازہ کھول کر شو فر کے ساتھ بیٹھ گئے۔ میں نے دیکھا کہ وزیر اعظم کی پیشانی پر ناگواری کی چند ٹکٹیں نمودار ہوئیں جیسے انہیں امتیاز کی حرکت پسند نہ آئی ہو۔ گاڑی کی نشستوں کے درمیان شیشے کا ایک شتر تھا جس کی وجہ سے آگے بیٹھنے والوں کے لئے گفتگو سنا مشکل تھا لیکن مسز بھٹو نے پھر بھی ہمیں یہ

بتانا پسند نہ کیا کہ وہ اس وقت رات گئے کس مشن پر جا رہے ہیں۔ دراصل وہ جنرل امتیاز کو ”آرمی کا آدمی“ سمجھنے لگے تھے۔ اور ان کی طرف سے بد اعتمادی کے شکار تھے۔ گاڑی شہری حدود سے باہر نکلی اور ایئرپورٹ کی سڑک سے ہوتی ہوئی سالہ کی طرف روانہ ہوئی، ہم سارا راستہ خوش رہے مگر ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

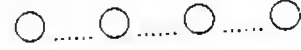
مولانا مفتی محمود، نواب زاوہ نھرا اللہ خان اور سردار قیوم سالہ ریٹ ہاؤس میں نظر بند تھے ہم انہیں سے ملنے جا رہے تھے۔ ہم سالہ پہنچے تو مولانا مفتی محمود، نواب زاوہ نھرا اللہ خان اور سردار قیوم نے بڑی خندہ پیشانی سے ہمارا ”استقبال“ کیا کسی قسم کی بد مزگی کا کوئی تاثر موجود نہ تھا۔ وزیر اعظم بھٹو، مفتی محمود اور نواب زاوہ صاحب کے ساتھ ایک صوبے پر جا بیٹھے ہیں سردار قیوم کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ ماحول نہایت خوش گوار تھا تمام بات چیت بڑے دوستانہ انداز میں آگے بڑھی۔ ماضی کی تینوں کو بھلا کر نئے سرے سے قومی سفر شروع کرنے کے سلسلے میں تبادلہ خیال ہوا۔ میں نے سردار عبدالقیوم سے کہا کہ ”اگر وہ چاہیں تو اس سلسلے میں بے حد مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں کیونکہ موجودہ صورت حال کو ملک زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکے گا۔“ سردار قیوم پاکستان کی محبت سے سرشار ہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں فوراً اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا اور بولے..... ”اگر میں کچھ کر سکتا ہوں تو حاضر ہوں“ مفتی محمود اور نواب زاوہ نھرا اللہ کا کہنا تھا کہ ساتھیوں سے مشورہ کے بغیر ہم مذاکرات شروع نہیں کر سکتے اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم سب کو ایک جگہ اکٹھا ہونے کا موقع دیا جائے۔

وزیر اعظم بھٹو بولے۔ ”کیوں نہ پہلے سردار قیوم صاحب مختلف مقامات پر نظر بند تمام رہنماؤں سے خود جا کر طیں اور انہیں صورت حال کی حقیقی کا احساس دلا کر مذاکرات کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کریں۔ پھر ہم تمام رہنماؤں کو ایک جگہ اکٹھا ہونے کا موقع بھی دے دیں گے۔“ مفتی محمود اور نواب زاوہ نھرا اللہ خان نے اس تجویز سے اتفاق کر لیا۔ چنانچہ طے پایا کہ سردار عبدالقیوم کی رہائی عمل میں لائی جائے گی تاکہ وہ پی۔ این۔ اے کے دیگر رہنماؤں سے مل کر مذاکرات کے لئے سنجیدگی سے تیار کر سکیں۔ وہ مختلف جیلوں میں نظر بند رہنماؤں سے ملاقات کر کے یہ فریضہ انجام دینے پر آمادہ تھے اور انہیں یقین تھا کہ وہ کامیاب رہیں گے ہم سب نے اس موقع پر ان کی کامیابی کے لئے دعا کی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

واپس پیر مسز بھٹو نے حد خوش اور مطمئن نظر آتے تھے۔ تاہم جنرل امتیاز کی گاڑی میں موجودگی کا وجہ سے انہوں نے اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں کی پی۔ ایم ہاؤس واپس پہنچے تو وزیر اعظم ہمیں ساتھ لے کر اپنی رہائش گاہ کی طرف چل دئے اور برآمدے میں بیٹھے ہی مجھ سے گویا ہوئے ”جو کچھ کہنا ہے“ اب کو..... راستے میں ہمیں اس لئے اشارہ کیا تھا کہ ”ان“ کا وہ ایجنٹ ساتھ بیٹھا تھا“ مسز بھٹو کا اشارہ واضح طور پر جریلوں کی طرف تھا۔ تھوڑی دیر ان کے ساتھ سالہ میں ہونے والی گفتگو کے مختلف پہلوؤں

پر بات جیت ہوتی رہی۔ وہ اپنی اس کامیابی پر بے حد مسرور نظر آرہے تھے۔ اچانک انہوں نے فون اٹھایا اور میجر جنرل عبداللہ ملک (سی۔ جی۔ ایس۔ برائے چیف آف آرمی سٹاف) کو بلائے کا حکم دیا۔ جنرل ملک پہنچے تو مسٹر بھٹو نے بغیر کسی ترمیم یا اضافہ کے یہ ”خوشخبری“ انہیں بھی سنائی کہ اپوزیشن کو مذاکرات پر آمادہ کرنے کی عملی کارروائی کا آغاز ہو گیا ہے جس کے اچھے نتائج نکلیں گے۔ جنرل ملک نے بھی اس پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ وہ ویسے بھی مسٹر بھٹو کے بے حد گرویدہ اور حقیقی خیر خواہ تھے۔ دوران گفتگو اچانک مسٹر بھٹو نے ان سے پوچھا..... ”آپ کے ہاں کیا خبریں ہیں؟“

عبداللہ ملک نے جواب دیا..... ”کچھ لوگ ذہنی تحفظ کا شکار نظر آتے ہیں“
 ”کوئی بات نہیں“ مسٹر بھٹو بولے۔ ”سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“



تیرہواں باب

مذاکرات کی راہ ہموار ہوتی ہے

وزیر اعظم بھٹو انتخابات کے نتائج کے فوراً بعد سے کور کمانڈرز کے ساتھ میٹنگیں کرتے رہے تھے۔ پرائم سٹراٹجس میں ہونے والی ایسی ہی ایک میٹنگ کے بعد کھانے کی میز پر عبداللہ ملک نے لاء اینڈ آرڈر بحال کرنے کے سلسلے میں آرمی کی ذمہ داریوں پر اظہار خیال کیا۔ ان کی بات ختم ہوئی تو راولپنڈی ڈویژن کے کور کمانڈر ٹیڈنٹ جنرل فیض علی چشتی نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ پھر خاصی بلند آواز میں بولے..... ”تم کور کمانڈر نہیں ہو، جنہیں کیا معلوم کہ ہماری کیا مشکلات ہیں؟۔ ہم کیوں گولی چلائیں؟ سیاست ہے تو سیاسی تغیر ہونا چاہئے!“

ان کی اس بات پر چند لمحے کیلئے پوری محفل پر گویا سا طاری ہو گیا۔ عبداللہ ملک فیض علی چشتی سے جو بیڑے تھے۔ محفل میں اور بھی ان سے کئی سینئر جنرل موجود تھے۔ وزیر اعظم کے چہرے کا رنگ یہ الفاظ سن کر سفیر ہو گیا تھا۔ اسی اثناء میں ٹیڈنٹ جنرل سوار خان، اور ارباب بھٹو، جہازیب بھی عبداللہ ملک کے پیچھے پڑ گئے اور محفل میں خاصی گرما گرمی بلکہ بد حرکی پیدا ہو گئی۔

وزیر اعظم بھٹو اس میٹنگ اور کھانے کے اختتام پر خاصے اپ سیٹ نظر آرہے تھے۔ اضمحلال ان کے چہرے سے عیاں تھا۔ مسٹر بھٹو کی موجودگی میں یہ پہلا موقع تھا جب جرنیلوں نے یہ انداز گفتگو اختیار کیا تھا اور درحقیقت لی این اے کے ساتھ مذاکرات کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنا بھی مسٹر بھٹو نے اس کے بعد ہی شروع کیا۔ ان پر سیاسی مذاکرات کی اہمیت آشکار ہو چکی تھی۔ وزیر اعظم نے جرنیلوں کے ساتھ اس قسم کی میٹنگوں اور کھانوں کا سلسلہ اس لئے شروع کیا تھا کہ وہ خود کو آرمی کے چیف آف سٹاف کی حد تک محدود کرنا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ تمام کور کمانڈرز کے ساتھ ان کے ذاتی دوستانہ تعلقات ہوں۔ بیشتر صاحبان سینگولڈن نہایت متحرک اور فعال نظر آئے۔ وہ اپنی گفتگو سے جلد ہی ماحول پر چھا جانے کی کوشش کرتے۔ ایسی ہی ایک میٹنگ میں جبکہ بھٹو صاحب کچھ کہہ رہے تھے۔ میں نے دیکھا..... کہ ان کا جملہ کھل ہونے سے پہلے دو جرنیلوں نے جو ساتھ ساتھ بیٹھے تھے، ایک دوسرے کو کہنیاں ماریں میں نے ان کی یہ حرکت دیکھی تو اسی وقت اندازہ کر لیا کہ جرنیلوں پر مسٹر بھٹو کی گرفت ڈھیلی ہو چکی ہے۔ اور اس سلسلے میں ان کے کھانے اور میٹنگیں شاید ہمارے آدر ثابت نہ ہو سکیں۔

کور کمانڈرز کے ساتھ ایک اور میٹنگ میں جب مختلف جنرل اپنے اپنے علاقوں کی صورتحال سے سسر بھٹو کو آگاہ کر رہے تھے، تو وزیر زراعت شیخ محمد رشید کے ساتھ فیئینٹ جنرل محمد اقبال کی زبردست جھڑپ ہوئی جنرل اقبال ان کے کیونٹ نظریات کی وجہ سے پہلے ہی ان کو تائبند کرتے تھے۔ اس جھڑپ کے بعد ماحول میں زبردست تکی آگئی تھی۔ جنرل ارباب جانا زب نے صاف طور پر سسر بھٹو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا..... ”میں تو اب یہ خطرہ محسوس ہونے لگا ہے کہ سپاہی کس پر ہی گولیاں نہ چلانا شروع کر دیں۔“ جنرل اقبال نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا..... ”آپ لاہور آئیں۔ میں علماء سے آپ کی میٹنگ کر سکتا ہوں۔“ میں نے اس دعوت پر خاموشی اختیار کر لی۔ چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق نے ماحول کو بہتر بنانے کیلئے جنرل اقبال اور شیخ رشید کو ایک دوسرے کے ساتھ نہ الجھنے کی تلقین کی۔ اس دوران حفیظ پیرزادہ نے وزیر اعظم والی تجویز پیش کی جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں کہ وزیر اعظم نے اس پر پہلے جنرل ملک سے مشورہ کیا تھا۔ حفیظ پیرزادہ کا کہنا تھا کہ ملک میں صرف اس سوال پر ریفرنڈم کر لیا جائے کہ سسر بھٹو وزیر اعظم رہیں..... یا..... نہ رہیں اور یہ کہ اگر عوام ان کے حق میں ہوں تو وہ آئین میں ترمیم بھی کر سکیں، وزیر اعظم کی جانب سے حفیظ پیرزادہ کی تجویز کے ساتھ اتفاق رائے ظاہر ہوتے ہی جنرل ضیاء الحق نے اس کی تائید کی، جس کے بعد باقی جرنیلوں نے بھی کہا کہ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ بھٹو صاحب نے جنرل ضیاء الحق کی طرف ایک مرتبہ پھر غور سے دیکھا تو وہ دوبارہ گویا ہوئے..... ”سر! ہمارے پاس جو انوں کو ”سیل“ کرنے کیلئے کچھ تو ہونا چاہئے تاکہ آرمی مطمئن رہ سکے۔“ بھٹو صاحب نے کہا..... ”میں ریفرنڈم اس بات پر کر اؤں گا کہ لوگ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں یا نہیں۔ مجھے آئین میں ترمیم کا قطعی حق بھی مل جائے گا جس کے ذریعے میں حکومت میں فوج کے کردار کا تعین کروں گا کیونکہ اب فوج کی شمولیت کے بغیر ملک کا نظام نہیں چل سکتا۔“

جنرل ضیاء الحق نے ان کی اس بات پر بھی سرت کا اظہار کیا اور بولے ”ٹھیک ہے سر! میں اس بات کو اپنے جوانوں کے سامنے ”سیل“ کر سکوں گا۔“ ذاتی طور پر میں اس میٹنگ میں صرف چند لوٹس لیتا رہا تھا اور ایک لفظ بھی بولنے سے گریز کیا تھا۔ ریفرنڈم کی تجویز سے مجھے ذاتی طور پر اتفاق نہ تھا کیونکہ اس میں کئی خلاء موجود تھے۔ سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ یہ ایک یکطرفہ فیصلہ تھا اس کیلئے کوئی گارنٹیڈ ورک نہ کیا گیا تھا۔ اگر اپوزیشن اسے مسترد کر دیتی ہے تو پھر کیا ہو گا؟ کیا ایجنڈیشن ختم ہو جائے گا؟ یہ سوالات اس وقت بھی میرے ذہن میں تھے۔

جمعہ ۱۳ مئی کو وزیر اعظم بھٹو نے قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے ریفرنڈم کی تجویز پیش کر دی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں عوام سے یہ فیصلہ کرانے کیلئے تیار ہوں کہ وہ مجھے چاہے جس پالیسی میں خود آزمائش میں پڑ سکتا ہوں لیکن قومی اسمبلی کو قربان نہیں کر سکتا۔ ہاری ہوئی پارٹی کو مجھ سے استعفیٰ طلب کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ”یہ انتظام عارضی ہو گا جس کیلئے آئین میں ترمیم کی جائے گی۔“

اگلے ہی روز پیرنگار نے پی این اے کی طرف سے اس تجویز کو مسترد کرنے کا اعلان کر دیا۔ پی این اے کے لیڈر سسر بھٹو سے اس لئے ”الریجک“ تھے کہ وہ کسی بھی وقت، کوئی سا بھی پتہ بالکل اچانک ہی کھیل جاتے تھے۔ ایک طرف جہاں وہ اپوزیشن کے ساتھ مذاکرات کی داغ بیل ڈال رہے تھے اور دوسری طرف جہاں وہ مصلحت کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے وہاں تیسری طرف انہوں نے اچانک ہی ریفرنڈم کا اعلان کر دیا تھا۔ پیرنگار کو تو ان کے بیان کے فوراً بعد ۱۵ مئی کو ان کی رہائش گاہ واقع مل روڈ پر نظر بند کر دیا گیا اور ۱۶ مئی کو حفیظ پیرزادہ نے ریفرنڈم کیلئے آئین میں ترمیم کا کل پارلیمنٹ سے منظور کر لیا جس کے مطابق ریفرنڈم کے نتائج کو کسی عدالت میں چیلنج نہ کیا جاسکتا تھا۔ اس سلسلے میں آئینی دفعات صرف ۳۰ ستمبر تک کارآمد قرار پائیں سب سے پایا کہ ریفرنڈم بجٹ اجلاس کے بعد ہو گا اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی سربراہی میں ریفرنڈم کمیشن قائم کیا جائے گا۔

سالہ میں نظر بند مفتی محمود کی طبیعت اس روز کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔ وہ ذیابیطس کے مریض تھے اور ان کے پاؤں کے انگوٹھے میں بھی تکلیف تھی تاہم انہوں نے کویت کے وزیر خارجہ شیخ صباح الاحمد جابر الصباح سے ڈیرہ گھنٹہ تک ملاقات کی اس ملاقات میں متحدہ عرب امارات کے سفیر راشد سلطان القادولی اور کویتی سفیر بھی موجود تھے۔ وزیر خارجہ ایک روز پہلے ہی اسلام آباد پہنچے تھے اور انہوں نے وزیر اعظم بھٹو کو بھی امیر کویت شیخ صباح السالم الصباح کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ وزیر اعظم نے ریفرنڈم کی تجویز کے ذریعے جو پیٹرن اچانک بدلا تھا اس کی وجہ سے پی این اے کے رہنما جن سے مذاکرات کے سلسلے میں کچھ پیشرفت ہوئی تھی سخت بددل تھے۔ شیخ ریاض المخطیب بھی اس سارے کھیل سے اب بیزار نظر آتے تھے لیکن کویتی وزیر خارجہ کی مفتی محمود سے ملاقات نے ماحول کو پھر سازگار بنانے میں مدد دی۔ ادھر سے آئی کو ایران کے وزیر خارجہ جو ہوشنگ انصاری بھی اسلام آباد آئے اور انہوں نے بھی سسر بھٹو کو شاہ امیر ان کا پیغام پہنچایا کہ حزب مخالف کے ساتھ سمجھوتہ کرنے میں تاخیر نہ کریں۔ ادھر سالہ کی ملاقات میں یہ طے پایا کہ سردار قیوم کی رہائی ایک روز بعد عمل میں آجائے گی تاکہ وہ خصوصی مشن پر روانہ ہو سکیں۔ ۱۹ مئی کو سردار قیوم رہا کر دیئے گئے۔ انہیں طیارہ بھی حکومت نے فراہم کیا اور وہ کراچی روانہ ہو گئے۔ انہوں نے اگلے روز کراچی میں اور اندرون نظر بٹور ہنساؤں سے ملاقاتیں کیں۔ گڑھی خیرو جیکب آباد میں وہ مولانا شاہ احمد نورانی سے سب سے پہلے ملے۔ دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھایا وہ بذریعہ کار وادو پہنچے جہاں انہوں نے پروفیسر غفور سے ملاقات کی۔ شام کو وزیر اعلیٰ غلام مصطفیٰ ہتوتی کے طیارے میں وہ کراچی واپس پہنچے اور رات کو انہوں نے سنٹرل جیل کراچی جا کر موجود حری ظہور الہی سے ملاقات کی۔ اگلے روز یعنی ہفتہ ۲۱ مئی کو وہ لاہور آئے جہاں انہوں نے مولانا محمود دوی سے ملاقات کی۔ بعد ازاں وہ بذریعہ طیارہ اوکاڑہ پہنچے اور اصغر خان سے ملاقات کی۔ جو بے حد طویل تھی۔ رات کو وہ دوبارہ مولانا محمود دوی سے ملے اور پھر اسی رات وہ راولپنڈی واپس آ گئے۔ جہاں انہوں نے اپنے دورے کی رپورٹ مفتی محمود کو پیش کی۔ مذاکرات کے

بقاعدہ آغاز سے قبل ہی جو ”ڈیڈ لاک“ رطلر عزم کی تجویز کے سبب آیا وہ ختم ہونے کی امید بندھ رہی تھی۔ سردار قیوم کی رپورٹ خاصی حوصلہ افزا تھی۔ اصغر خان کے علاوہ تقریباً تمام رہنماؤں نے مذاکرات پر آبادگی ظاہر کی تھی۔ اصغر خان کا اصرار تھا کہ انہوں نے فوج کے نام جو خط لکھا ہے اس کے ”مثبت نتائج“ اب جلد برآمد ہونے ہی والے ہیں اور جرنیل بھٹو حکومت کا تہمتہ لٹنے والے ہیں لہذا بھٹو سے کسی بھی قسم کے مذاکرات کرنا بالکل فضول بات ہے۔ مذاکرات کی بجائے وہ ایجیٹیشن کو تیز کرنے کی ضرورت پر زور دیتے رہے تاہم سردار قیوم نے انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اگر حکومت تمام رہنماؤں کو رہا کر کے کچھا ہونے کا موقع فراہم کر دے تو مذاکرات کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ اتفاق رائے سے کر لیا جائے گا۔ سردار قیوم نے فوج کی مداخلت کے خیال کو خطرناک قرار دے کر اصغر خان سے گزارش کی کہ وہ ایسی کوئی حرکت نہ کریں جس سے فوج کو مداخلت کا موقع مل جائے۔ ۲۲ مئی کی رات سردار عبدالقیوم نے وزیر اعظم بھٹو سے ملاقات میں تمام باتیں ان کے گوش گزار کر دیں۔ اگلی صبح وہ اپنے مشن پر حیدر آباد روانہ ہو گئے جہاں وہ ولی خان اور غوث بخش بزنجو سے ملے۔ اور واپسی پر کراچی میں جو دھری ظہور النبی سے ملاقات کی۔ ادھر بی بی گار نے ہری پور جیل میں اسی روز بیگم نسیم ولی خان سے ملاقات کی۔ سردار قیوم ۲۲ مئی ہی کو واپس راولپنڈی آئے اور مفتی محمود کو رپورٹ دینے کے علاوہ انہوں نے سعودی عرب کے سفیر سے بھی ملاقات کر کے انہیں معاملات سے آگاہ کیا۔ ۲۳ مئی کی صبح وزیر اعظم بھٹو سے ملے۔ میں اسی روز ایک دن کے دورے پر حیدر آباد گیا تھا۔ بھٹو سے ملاقات کے دوران سعودی سفیر بھی موجود تھے۔ اسی روز زنی ایل او کے سربراہ یا سرمرقات کے خصوصی ایلچی حالی الحسن بھی وزیر اعظم بھٹو کے نام پیغام لے کر پہنچے۔ جس میں یا سرمرقات نے مفاہمت کرانے کیلئے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ سردار قیوم نے راولپنڈی میں خان اشرف اور خاتون بیگم نسیم ولی خان سے ملاقات کی۔ ۲۵ مئی کو حالی الحسن نے مفتی محمود اور سعودی سفیر ریاض الخطیب سے ملاقات کی اور انہوں نے امید ظاہر کی کہ مذاکرات آئندہ ۲۸ گھنٹوں میں شروع ہو جائیں گے۔

ان نازک ترین لمحات میں دوست ممالک کی جانب سے جو کچھ پاکستان کیلئے کیا گیا اس کی مثال کسی ذمہ دار سے ملک کی تاریخ پیش نہیں کی جاسکتی۔ مسلسل ہنگاموں کی وجہ سے تقریباً ایک ہلال ب ۲۵ کر ڈر دہے مالیت کی اٹاک تباہ ہو چکی تھی۔ ایسے میں سردار عبدالقیوم کے مشن کی کامیابی ایک بہت بڑی خوشخبری تھی۔ قومی اتحاد کے رہنماؤں کی اکثریت نے حکومت کے ساتھ مذاکرات پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ اور مذاکرات میں شریک فریقوں کی یکساں تعداد میں اتفاق رائے ہو گیا تھا۔ ۲۶ مئی کو سردار عبدالقیوم نے ایک پریس کانفرنس کے ذریعے قومی اتحاد اور حکومت کے مابین مذاکرات کا قاعدہ اعلان کیا۔ سردار صاحبان دونوں پریس کی آنکھوں کا تارہ بنے ہوئے تھے مجھے یاد ہے جب وہ بھٹو صاحب سے ملے تو انہوں نے سردار صاحب سے کہا:

”سردار صاحب پریس میں یا تو نور جہاں کو پہنچی ملتی ہے یا پھر آپ کو“ وزیر اعظم کو آمادگی کی یہ اطلاع سعودی سفیر شیخ ریاض الخطیب کے ذریعے پہنچائی گئی تھی جنہیں قومی اتحاد خاص بنانا چاہتا تھا۔ دونوں فریقین نے مذاکرات کیلئے اجنڈا تیار کرنا شروع کیا۔ کابینہ کے خصوصی اجلاس نے بھٹو کو مذاکرات کا مکمل اختیار دے دیا۔ میں ۲۸ مئی کو علماء کے ایک اجلاس سے خطاب کرنے پشاور پہنچا تھا۔ ۳۰ مئی کو اجلاس سے خطاب کیا اور علماء سے ملک میں مفاہمت کی فضا پیدا کرنے کی اپیل کی! اسی روز وزیر اعظم بھٹو کا فون پہنچا۔ ”فورا آؤ۔۔۔ مذاکرات میں حفیظ اور تمہیں میری معاونت کرنا ہے“۔ میں اسلام آباد پہنچا تو وزیر اعظم مجھے پریس کانفرنس کے ذریعے یہ اعلان کرنے کا فریضہ سونپا کہ۔۔۔ مذاکرات جمعہ ۳ جون کو شروع ہوں گے۔ مسز بھٹو نے بیگم نسیم ولی خان کی رہائی کا حکم دے دیا تھا۔ مذاکرات کیلئے کسی جانب سے کوئی پیشگی شرط نہیں رکھی گئی تھی۔ مفتی محمود کو زبانی طور پر اس کی اطلاع دی گئی تھی کہ مذاکرات ۳ جون کو ایمان وزیر اعظم میں شروع ہوں گے۔ میں نے پریس کانفرنس میں سعودی عرب کے اس ناقابل فراموش کردار کا بھی تذکرہ کیا جو اس نے مذاکرات کیلئے سرانجام دیا تھا۔ شیخ ریاض الخطیب کو ہر بات سے پوری طرح آگاہ کر کھاجا رہا تھا۔

۳۱ مئی کی صبح ساڑھے دس بجے وزیر اعظم نے فوجی حکام کا خصوصی اجلاس بھی طلب کیا تھا۔ جس میں تینوں مسلح افواج کے سربراہوں کے علاوہ چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی اور کور کمانڈرز کو شرکت کرنا تھی۔

فوجی حکام کے ساتھ مذاکرات سے عین پہلے پھر خصوصی اجلاس کا حکم سن کر میرا ہاتھ ٹھنکا۔ کیا وزیر اعظم پھر کوئی ہینترہ بدلنے والے ہیں۔ میں نے خدا سے گڑگڑا کر دعا کی۔۔۔۔۔۔ ”اللہی ملک کو بچانا“ اب پھر کوئی نیامستہ کھڑا نہ ہو جائے!۔۔۔



چودھواں باب

جرنیل ایکسپوز ہوتے ہیں۔

یوں تو مذاکرات شروع ہونے سے پہلے فوجی جرنیلوں سے ہمارے کئی مشترکہ اجلاس ہو چکے تھے جن میں ریفرنڈم کی تجویز بھی زیر غور آئی، دو بارہ ایکشن کرانے کی بات بھی چلی میں ان میں ضرورت سے زیادہ کبھی نہیں بولا لیکن معنی میں ہونے والے ایسے ہی ایک اجلاس میں مجھے نسبتاً مفصل اظہار خیال کرنا پڑ گیا۔

ساتھ اجلاس میں جرنیل صاحبان ریفرنڈم کی تجویز کو قبول کر چکے تھے ان کا کہنا تھا کہ وہ اسے اپنے ”جوانوں“ کے سامنے ”سیل“ کر سکیں گے ٹیکری۔ این۔ اسے کی طرف سے ریفرنڈم کے بائیکاٹ کے اعلان کے بعد صورت حال اچانک تبدیل ہو گئی اور جرنیل صاحبان بھی ریفرنڈم کے خلاف ہو گئے۔ اجلاس شروع ہوا اور وزیر اعظم نے منزل ضیاء الحق کو اظہار خیال کی دعوت دی تو انہوں نے کہا۔ ”سر! ریفرنڈم کی تجویز تو نہیں چلے گی، ہمارے جوان بھی اس سے مطمئن نہیں ہوئے اور ادھر اپوزیشن نے بھی اسے مسترد کر دیا ہے“

”پھر اب کیا ہو“، مسز بھٹو نے کہا، اس پر مختلف اصحاب بولتے رہے، میری باری آئی تو مجھ سے نہ رہا گیا، میں دل کی بات زبان پر لے آیا، مجھے اس وقت تک فوج کے عزائم کا اندازہ ہو چلا تھا میں اس ساری ٹیم کو ایکس پوز کر دینا چاہتا تھا، میں نے کہا۔ ”مسئلے کے حل کی پانچ صورتیں ممکن تھیں۔“

ایک یہ کہ یہ حکومت برقرار رہے اور آپ بدستور اس کا ساتھ دیتے رہیں، آپ کہتے ہیں کہ یہ مشکل ہے، آپ کو ڈر ہے کہ لائینڈ آرڈر کے نفاذ کے لئے اب آپ کے جوان گولی چلانے سے انکاری ہیں۔

دوسری صورت یہ تھی کہ دو بارہ انتخابات کروائے جائیں وزیر اعظم صاحب بھی اس سلسلے میں متذبذب ہیں اور آپ بھی کہتے ہیں کہ اس وقت جذبات اتنے مشتعل ہیں اور پولرائزیشن اتنی شدید ہے کہ الیکشن کے نتیجے میں خون خرابہ ہو گا۔

تیسرا راستہ یہ تھا کہ موجودہ حکومت مستعفی ہو جائے اور پی۔ این۔ اے اقتدار سنبھال لے، آپ

کہتے ہیں کہ یہ صورت بھی آپ کو منظور نہیں کیونکہ پی۔ این۔ اے میں بعض ایسے عناصر شامل ہیں جو پاکستان کے وفادار نہیں ہیں۔

چوتھی صورت ریفرنڈم کی تھی جس کا اعلان آپ کی منظوری سے ہوا تھا مگر اب آپ کہتے ہیں کہ یہ بھی نہیں چلے گا، پی۔ این۔ اے سے مسترد کر چکے ہیں اور آپ کے ’جوان‘ بھی اس سے مطمئن نہیں ہیں۔

اب پانچویں اور آخری صورت ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ فوج ”ٹیک اور“ کر لے اور جب حالات درست ہو جائیں تو آپ حضرات خود الیکشن کروائیں اس کے علاوہ کوئی اور صورت ممکن ہی نہیں جس سے موجودہ خلفشار ختم ہو سکے اور آپ کے ”جوان“ بھی مطمئن ہو سکیں۔“

میں نے وزیر اعظم سے اجلاس شروع ہونے سے پہلے نہ تو اپنی اس تقریر کے مضمون کا ذکر کیا تھا نہ ہی مجھے اندازہ تھا کہ اس پر ان کا رد عمل کیا ہو گا۔ مگر میری تقریر ختم ہوتے ہی انہوں نے زبردست طریقے سے میری مکمل تائید کی، انہوں نے کہا۔

”میں مولانا سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں، اب واقعی یہ ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ آرمی ٹیک اور کرے اور اگر آپ لوگ چاہتے ہیں تو میں بخوشی حکومت سے دست بردار ہونے کے لئے تیار ہوں میں آج ہی لاؤنڈ کانڈ چلا جاتا ہوں۔“

جنرل ضیا جواب تک ساری گفتگو کے دوران خاموش تھے۔ بھٹو صاحب کی یہ بات سن کر اچانک اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے انہوں نے قدر سے جھکتے ہوئے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھا اور کہا۔

“NO SIR, WE HAVE NO SUCH INTENTION, WE ARE THE RIGHT ARM
OF THE GOVERNMENT. WE ARE LOYAL AND WE WILL REMAIN
LOYAL”

(نہیں جناب! ہمارا کوئی ایسا ارادہ نہیں، ہم حکومت کا دایاں بازو ہیں ہم وفادار ہیں اور وفادار رہیں گے)

جنرل ضیا کی اس نعتیں دہانی کے بعد بات بظاہر ختم ہو گئی تھی وہ رخصت ہوئے تو وزیر اعظم نے مجھے اور حفیظ پیرزادہ کو اشارہ کیا کہ ہم ان کے ساتھ چلیں، ہم پرائم منسٹر کے رہائشی حصہ کے لان میں چھٹی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو حفیظ نے جھونٹے ہی کہا۔

”سر مبارک ہو آج تو مسئلہ صاف ہو گیا، فوج بھی پوری طرح آپ کے ساتھ ہے۔“

”آپ کا کیا خیال ہے؟“ مسز بھٹو نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے حفیظ کی رائے سے اختلاف ہے“ میں نے جواب دیا ”میرا خیال ہے آج، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲

کرے گی۔“

”دو کیسے؟“ بھٹو صاحب نے پوچھا میں نے کہا ”اس کے دو اسباب ہیں“ ایک تو آج کی مینٹلگ میں جنرل ضیا کا غیر معمولی طور پر کھڑے ہو جانا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر یقین دلانا جو میرے نزدیک ہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب آپ آخر میں تقریر کر رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ دو جرنیل جنہوں نے کہتیاں میز پر ٹکرائی تھیں، آپ کے یہ کہنے پر کہ آپ حکومت چھوڑ کر لڑاؤ نہ جانے پر تیار ہیں، انہوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں کہنیاں ماریں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ اندر ہی اندر کوئی کھجوری پک رہی ہے۔“

بھٹو بولے..... ”میں تم سے پورا پورا اتفاق کرتا ہوں۔“

بعد ازاں جب بھٹو صاحب مری میں حفاظتی نظر بندی میں تھے تو کہا کرتے تھے..... ”یار ضیا و تساری ۳۱ مئی کی تقریر کو بھولا نہیں ہو گا۔ تم سنے اس دن ان لوگوں کو پوری طرح ایکس پوز کر کے رکھ دیا تھا۔“

لاہور ہائی کورٹ میں نصرت بھٹو کیس کے دوران اپنے بیان حلفی کے پیرا گراف نمبر ۴ میں مسٹر بھٹو نے لکھا ہے۔

“IT IS PERTINENT TO POINT OUT HERE THAT IN MY MEETING WITH THE C.M.L.A. IN RAWALPINDI ON 28TH AUGUST, 1977 IN WHICH GEN CHISHTI WAS PRESENT, THE C.M.L.A WAS EXCESSIVELY HARSH ON MAULANA KAUSAR NIAZI. IN HIS CHARACTERISTIC FASHION, HE ATTACKED THE MAULANA MERCILESSLY. HE SHOWED SO MUCH HATRED FOR NIAZI THAT AT THE END OF THE DIATRIBE, THE C.M.L.A. CONCLUDED BY SAYING, “THIS IS ONE MAN I AM NOT GOING TO SPARE”. ○

”یہاں یہ ذکر کرنا مناسب ہو گا کہ ۲۸ اگست ۱۹۷۷ء کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ساتھ راولپنڈی میں میری ملاقات کے دوران جس میں جنرل چشتی بھی موجود تھے، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مولانا کوثر نیازی پر غیر معمولی طور پر گرجے رہے تھے۔ اپنے مخصوص انداز میں انہوں نے مولانا کوثر نیازی کی حمایت بے ریمانہ حملے کئے۔ انہوں نے مولانا کوثر نیازی کے لئے اس قدر نفرت کا اظہار کیا کہ ان کی

جملہ برائیوں کا بیان اس بات پر ختم ہوا تھا کہ..... ”یہ واحد آدمی ہے جسے میں کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا۔“

مسٹر بھٹو کے بیان حلفی کا یہ حصہ پیپلز پارٹی کے ان جینالے کارکنوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہو گا۔ جو اپنی موجودہ چیئرمین اور چیئرمین کے ایما پر مجھ غریب پر رات دن تیرا کرتے نہیں تھکتے جن کے نزدیک میں آرمی کا آدمی ہوں، جنرل ضیا سے میری گاڑھی چھتی ہے، وہ میرے بغیر لقمہ بھی نہیں اٹھاتے اور یہاں یہ بات واضح ہے کہ جب بھٹو نے یہ بیان حلفی دیا۔..... بیگم نصرت بھٹو مجھے پیپلز پارٹی کے قائم مقام جنرل سیکرٹری، سیکرٹری اطلاعات، مجلس عاملہ کے رکن ہی کے عہدوں سے آمرانہ انداز میں برطرف نہیں کر چکی تھیں بلکہ میری پارٹی کی رکنیت بھی ختم کی جا چکی تھی۔

ان کے بیان حلفی کا یہ حصہ اس الزام کے جواب میں ہے جو ان پر اس وقت کے مشیر برائے قومی سلامتی لفٹیننٹ جنرل غلام حسن کی رپورٹ برائے سی۔ ایم۔ ایل۔ اے میں ”داخلی صورت حال“ کے عنوان سے عائد کیا گیا تھا اور مسٹر بھٹو، حفیظ پیرزادہ اور میری طرف ایک غلط بات منسوب کی گئی تھی کہ مسٹر بھٹو اور حفیظ پیرزادہ انتخابات کے بائیکاٹ کی کوشش کر رہے تھے جبکہ مولانا کوثر نیازی نے انتخابات میں حصہ لینے اور بحران پیدا ہونے دینے کی کوشش میں ان کی مخالفت کی۔ درحقیقت ہمارے درمیان اس قسم کی کوئی بات کبھی نہ ہوئی تھی اور مسٹر بھٹو نے اپنے بیان حلفی کے پیرا گراف نمبر ۱۲ میں بجا طور پر یہ کہا ہے کہ (پیپلز پارٹی کا کوئی فرد اس الزام کی صداقت تسلیم نہیں کر سکتا کہ میں انتخابات کا بائیکاٹ کر کے بحران پیدا کرنے کے حق میں تھا۔ انہوں نے مزید لکھا ہے کہ مجھے غلط طور پر کوثر نیازی کے خلاف حفیظ پیرزادہ کے ساتھ بریکٹ کیا گیا ہے یہ بات کوثر نیازی اور حفیظ پیرزادہ پر بھی بہتان ہے کیونکہ حفیظ میرے لئے میرے بیٹوں کی طرح ہیں۔ جبکہ کوثر نیازی ایک ”دیدور“ ہیں۔ ان دونوں پر اس طرح کی بہتان تراشی محض پریوں کی کمافی قرار دی جاسکتی ہے۔) ○

بھٹو صاحب کے ان الفاظ کی موجودگی میں مجھ پر فوجی حکومت کے ساتھ کسی ساز باز کا الزام عائد کرنا خود مرحوم بھٹو کے ساتھ جتنی بڑی زیادتی ہے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے مارشل لاء کے پورے دور میں اور بعد ازاں مارشل لاء کے خاتمہ کے بعد مجھے وزارت قبول کرنے کی کتنی پیش کشیں ہوئیں ان سے واقفان حال خوب آگاہ ہیں اور یہ سلسلہ اس کے بعد شروع ہوا جب ۱۹۷۹ء میں مسٹر زیڈ۔ اے۔ بھٹو ان کے خاندان اور ساتھیوں کے خلاف حکومت پاکستان کا وائٹ پیپر (جسے میں بلیک پیپر کتابوں) شائع ہوا جس میں مسٹر بھٹو کے بعد سرفہرست ان کے ساتھیوں میں میرا نام تھا اور مجھ پر الزامات کے طوفان باندھے جا رہے تھے۔

ان الزامات کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے، وائٹ پیپر شائع ہونے کے بعد مجھے مختلف سطحوں پر انکوٹری کے لئے بلا یا گیا، میرے چھ سال کے بنک اکاؤنٹس منگوا کر ایک ایک چیک کے بارے میں مجھ سے سوالات کئے گئے، اپنا لاہور کا گھر اور پریس بیچ کر اور ایک بنک سے قرضہ لے کر میں نے اسلام آباد میں جو گھر بنا یا تھا اس کے ٹھیکیدار کو بار بار بلوایا گیا۔ اور اس سے مکان کی تعمیر کے سلسلے میں میری طرف سے دیئے جانے والے حسابات کے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی، جب کچھ نہیں ملا تو میری سابقہ وزارت نے ”وائٹ پیپر کے الزامات کی روشنی میں مجھ سے خط کتابت شروع کی اور لین دین کا سوال اٹھایا، یہ خط کتابت پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا ایک ایک خط میرے پاس محفوظ ہے، میں نے ۷ مئی ۱۹۷۹ء کو وزارت کو جو مراسلہ بھیج دیا تھا چار سال کے بعد ۲۳ جنوری ۱۹۸۳ء کو اس کا جواب مجھے موصول ہوا اور یہ حکومت کی طرف سے مجھے آخری خط تھا، ساڑھے تین سال گزر گئے اب تک حکومت کو جرأت نہیں ہو سکی کہ ذہ نام نہاد وائٹ پیپر کی روشنی میں مجھ سے ایک پیسے کا بھی تقاضا کر سکے، میرا یہ آخری خط اگر تاریخین کی ضیافت طبع کے لئے یہاں درج کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہو گا، اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکے گا کہ فریق ثانی کی بات سے بغیر اور اسے منطقی کاموقع دینے بغیر ”وائٹ پیپر“ کے دفتر بے معنی، کتنا حقیقی وزن رکھتے ہیں، میں نے اپنے خط میں لکھا ہے:-



محترمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میرے مراسلہ مورخہ ۷ مئی ۱۹۷۹ء کا جواب چار سال بعد آپ کے مکتوب مورخہ ۲۳ جنوری ۱۹۸۳ء کے ذریعے موصول ہوا، وزارت کی اس شاندار کارکردگی پر مبارکباد قبول فرمائیے۔

”مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میں نے اپنے خط میں جن نکات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرائی تھی آپ کے جواب میں ان پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی۔

۱۔ میں نے عرض کیا تھا کہ وزارت کی استحقاق کے مطابق وزارت کے خاتمہ کے بعد بھی میں پندرہ دن کی تنخواہ بعد الاؤنس، کر ایہ مکان وغیرہ کا حق دار تھا، آپ نے اس نکتے پر کوئی بحث نہیں کی، اگر آپ کو کوئی شبہ ہو تو اس سلسلے میں آپ کی بحث ڈویژن سے رجوع فرمائیں۔

۲۔ میں نے لکھا تھا کہ میرا ایک ذاتی ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ سرکاری گاڑی میں لگا ہوا تھا، جس کی تصدیق آپ اس وقت کے میرے ڈرائیوروں (مسٹر شیر دین اور مسٹر اللہ دین) سے کر سکتے ہیں، آپ نے ریڈیو کی موجودگی کی تصدیق کی ہے اور ریکارڈنگ کا ذکر گول کر دیا ہے اور اس طرح چھ سال کے بعد اب آپ فرماتے ہیں کہ میں وزارت کے دفتر میں آکر ریڈیو وصول کر لوں، جو اباً گزارش ہے کہ چھ سال کا ایک استعمال شدہ ریڈیو اب میرے کس کام کا ہے، مجھے اس کی قیمت ادا کی جائے۔ (ویسے برسیل تذکرہ عرض کرتا ہوں کہ آپ سے یہ نہیں ہو سکا کہ اس دوران ریڈیو کسی کے ہاتھ بھجوا دیں بلکہ مجھ سے ہی خواہش کی ہے کہ میں ہی اس کی وصولی کے لئے آپ کے دربار میں حاضری دوں)

۳۔ میں نے لکھا تھا کہ میری نہایت قیمتی ذاتی آئینہ اب میں میرے آفس میں تھیں ان کی تصدیق (اس وقت کے او۔ ایس۔ ڈی مسز فیض جو اس وقت آپ کی وزارت میں کام کر رہے تھے) سے کر لی جائے، یہ مجھے لوٹاؤں یا جسٹس یا پھر ان کی

اب سوچتا ہوں تو مجھ پر ہونے والی ان نوازشات کی وجہ میری وہ تقریر تھی جو میں نے جرنیلوں کی اس
بینگ میں کی تھی۔ بعد میں جب ہم گرفتار ہو کر مری آئے تو بھٹو صاحب بھی مجھ سے کہا کرتے تھے۔
”یار! تمہاری وہ تقریر جرنیل نہیں بھول سکتے“ اس دن تو وہ ایکس پوز ہو کر رو گئے تھے۔“



قیمت مہو ہر جانہ ادا کی جائے مگر آپ نے سرے سے اس کا جواب ہی گول کر دیا
ہے۔

۴۔ آپ کی طرف سے پانچ ہزار آٹھ سو پچاس روپے کی ادائیگی کے
مطالبے کا جواب ان نکات کے طے پا جانے کے بعد دیا جائے گا۔

۵۔ جہاں تک جج ویلفیئر فنڈ سے چھبیس ہزار روپے کا میرے لئے زر مبادلہ
خریدے جانے کا تعلق ہے میں اپنے ۱۹ مئی ۱۹۷۹ء کے خط میں اس کا جواب لکھ چکا
ہوں جو آپ کے ڈیوٹی کلرک نے ۲۰ مئی ۱۹۷۹ء کو وصول کیا ہے لہذا کہہ کر ایک بار
پھر اس کی طرف مراجعت فرمائیے میں نے عرض کیا تھا کہ مجھے وہ دستخط دکھائیے جس
کے تحت میں نے یہ رقم وصول کی ہے اگر آپ کے آفس میں میرے نام پر کسی نے یہ
رقم وصول کی ہو تو میں اس کا ذمہ دار نہیں، آپ یہ وصولی اس سے کیجئے، میں نے
لکھا تھا کہ:-

”میں متعلقہ فائل کی فوٹو کاپی کا انتظار کروں گا۔“

اور چار سال گزر جانے کے باوجود اب تک وہ فوٹو کاپی مجھے موصول نہیں
ہوئی۔

کوثر نیازی

مذاکرات کے دوران پیپلز پارٹی مسودہ پیش کرتی ہے۔

تیم جون ۱۹۷۷ء کو شیخ ریاض الخلیب نے مسز بھٹو کے ساتھ آدھ گھنٹہ تک ملاقات کی اور انہیں آگاہ کیا کہ پوزیشن ان سے یہ ضمانت چاہتی ہے کہ مسز بھٹو قومی اتحاد کے رہنماؤں کے ساتھ کسی سیاسی چال کا مظاہرہ نہ کریں گے اور نہ ہی مذاکرات کے دوران ہونے والی گفتگو کو عوامی سطح پر ظاہر کیا جائے گا۔ مسز بھٹو نے کھلے دل سے انہیں یقین دلایا کہ وہ اپنی طرف سے یہ ضمانت ملی۔ این۔ اے کو فراہم کر سکتے ہیں۔ سعودی سفیر نے درحقیقت مذاکرات کے لئے راہ ہموار کی تھی اور ان کی پوزیشن ایک حقیقی ثالث کی تھی۔ ان کے فیصلے جانب دارانہ اور مخلصانہ کردار ہی کے نتیجے میں قومی اتحاد کے رہنماؤں کی باتوں پر توجہ دیتے تھے۔ متحدہ عرب امارات کے شیخ زید بن سلطان چونکہ مسز بھٹو کے ذاتی دوست تھے، اس لئے ان کے سفیر کے رویتے سے بھی قومی اتحاد کے رہنما اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کا کردار جانب دارانہ ہے۔ مفتی محمود کے ساتھ ان کی ایک ملاقات کے دوران تو دونوں میں اچھی خاصی جھڑپ بھی ہو گئی تھی اور مفتی صاحب نے انہیں سختی سے منع کر دیا کہ وہ آئندہ ان سے ملنے نہ آئیں۔ کونیت کے وزیر خارجہ بھی بھٹو کے ذاتی دوست ہونے کی وجہ سے زیادہ متاثر کن کردار ادا نہ کر سکے لیکن شیخ ریاض الخلیب کا دونوں طرف یکساں رویہ تھا۔ وہ مسز بھٹو سے ملنے کے بعد سالہ گئے جہاں انہوں نے مفتی محمود کو وہ تمام ضمانتیں فراہم کر دیں جو وہ چاہتے تھے۔ مفتی صاحب سے ان کی ملاقات ڈیرہ گھنٹے پر محیط تھی اس دوران پیر صاحب پیکر ایشرف، نواب زادہ نصر اللہ خان اور سردار عبدالقیوم موجود تھے۔ مسز بھٹو کی منظوری کے ساتھ شیخ ریاض الخلیب نے مفتی محمود کو اس امر سے بھی آگاہ کر دیا کہ مذاکرات میں مسز بھٹو کی معاونت کو خیر نسب زسی اور حفیظ پیر زادہ کریں گے چنانچہ مفتی صاحب نے بھی اپنے معاونین کے ناموں سے انہیں آگاہ کر دیا تاکہ کل ان کی باضابطہ رہائی عمل میں لائی جاسکے۔ مفتی صاحب نے باہمی صلاح مشورے سے اپنے معاونین کے طور پر نواب زادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور احمد کا نام لیا، تاہم انہوں نے شیخ ریاض الخلیب کے سامنے اس امر پر پھر اصرار کیا کہ مذاکرات کی بنیاد وہی ہوگی جو ۸ مئی کو بھٹو صاحب سے ملاقات کے دوران طے ہوئی تھی۔ جمعرات ۲ جون کو مجھے ان تمام معاملات

کے بارے میں پریس بریفنگ کرنا تھی لیکن جب اتحاد کے رہنماؤں کا یہ مطالبہ سامنے آیا کہ عوامی سطح پر اس وقت تک کوئی بات نہ لائی جائے گی جب تک حتمی سمجھوتہ نہیں ہو جاتا تو میں شش دن میں پڑ گیا۔ میری اور وزیر اعظم کی یہ متفقہ رائے تھی کہ ہم بات چیت کے ہر موڑ سے عوام کو کامل آگاہ رکھیں تاکہ اقتدار کی طرف لچکائی ہوئی نظریں ڈالنے والے جرنیلوں کو محاذ رکھا جاسکے ہم نے یہ نقطہ نظر لی۔ این۔ اے والوں کو بھی سمجھانے کی کوشش کی لیکن بدقسمتی سے وہاں جتنی زبانیں تھیں اتنی ہی بولیائیں تھیں۔ وہاں کسی بات پر اتفاق رائے کم ہی ہوتا تھا۔ اصغر خان تو مرے سے مذاکرات ہی کے خلاف تھے اور انہوں نے جیل سے پیغام بھجوایا تھا کہ بھٹو حکومت سے کسی طرح کے مذاکرات کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ فوج عنقریب اقتدار سنبھالنے والی ہے جس کے بعد نوے دن کے اندر فوج انتخابات کرا دے گی۔ اس بات کی شہادت پروفیسر غفور احمد، نواب زادہ نصر اللہ خان اور سردار عبدالقیوم دے سکتے ہیں بلکہ مفتی محمود نے تو اپنی وفات سے قبل ایک بیان میں صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ اصغر خان کے جرنیلوں سے باقاعدہ رد وابطل تھے اور مارشل لاء انہوں نے لگوا دیا ہے۔ ۲ جون کو پی۔ ایم۔ ہاؤس میں وفاقی کابینہ کا پانچ گھنٹے طویل اجلاس ہوا جس کی وجہ سے رات گئے میں نے اخبار نویسوں سے ملاقات کی جو قوم کو اگلے روز شروع ہونے والے مذاکرات کے سلسلے میں کوئی خوشخبری سنانے کے لئے بے چین تھے۔ مجھے اس امر کے اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ ہمارے قومی پریس نے اس وقت انتہائی مثبت رویے کا مظاہرہ کرتے ہوئے حکومت اور قومی اتحاد کے درمیان مذاکرات کی کامیابی کے لئے اور مارشل لاء کا راستہ روکنے کے لئے کسی بھی قسم کے ”شوٹے“ چھوڑنے سے مکمل گریز کیا۔ میں رات گئے انہیں صرف اتنا بتا سکا کہ یہ مذاکرات سعودی عرب کی کوششوں سے شروع ہو رہے ہیں۔ حزب اختلاف کے رہنما بہت محتاط ہیں وہ خدشات اور توہمات کے بھی شکار ہیں اتحاد کے بنیادی مطالبات میں دوبارہ انتخابات نئے الیکشن کمیشن کا قیام اور مسز بھٹو کا استعفیٰ شامل ہیں، لیکن اس کا جواب ان کے پاس بھی نہیں کہ اگر مسز بھٹو مستعفی ہو جاتے ہیں تو اقتدار کس کے حوالے کریں؟ میں نے پریس کو بتایا تھا کہ مذاکرات کے ہر مرحلے سے سعودی سفیر کو باخبر رکھا جا رہا ہے۔

اسی روز اپنی رہائی کے بعد مفتی محمود اور نواب زادہ نصر اللہ خان شیخ ریاض سے ملنے ان کی قیام گاہ پر گئے اور ایک مرتبہ پھر مذاکرات کے سلسلے میں مسز بھٹو کے خلوص نیت کے بارے میں ان سے ضمانت طلب کی جب کہ پروفیسر غفور اپنی جماعت کے سربراہ مولانا مودودی سے ہدایات لینے اور انہیں سارے معاملات سے آگاہ کرنے کے لئے لاہور روانہ ہو گئے۔ وہ بتا کر گئے تھے کہ کل صبح مذاکرات سے پہلے اسلام آباد پہنچ جائیں گے۔ صدر فضل الہی چوہدری نے اسی شام وزیر اعظم کے مشورے پر قومی اسمبلی کا بجٹ اجلاس بھی سوساری شام کو چھ بجے طلب کر لیا تھا۔

مذاکرات کا پہلا دورانیہ۔ ایم ہاؤس میں ۳ جون کو مکمل ہوا تو حکومت نے پی۔ این۔ اے کے جو مطالبات تسلیم کئے ان کے مطابق اصغر خان، مولانا شاہ احمد نوری اور خان اشرف کو فوری طور پر رہا کر دیا گیا۔ اخبارات سے ہنسر شپ ختم کر دی گئی دفعہ ۱۳۴ کے تحت تمام گرفتار شدگان کی رہائی عمل میں آ

گئی۔ تحریک کے دوران ہلاک اور زخمی ہونے والوں کو معاوضہ کی ادائیگی کا مطالبہ بھی مان لیا گیا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے ایک طرف پروپیگنڈہ بند کرنے کی بات بھی تسلیم کر لی گئی اور ہماری جانب سے نہایت فریادانہ طور پر یہ سارے ابتدائی مطالبات تسلیم کرنے کے جواب میں خیر سگالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قومی اتحاد نے بھی مذاکرات کے فیصلے تک ایچی نیشن فتح کرنے کی بات تسلیم کر لی۔ پی۔ ایم۔ ہاؤس کے آئیوٹریم میں مذاکرات کے اختتام پر میں نے اور پروفیسر غفور احمد نے پریس بریفنگ کی جس میں متذکرہ فیصلوں پر جی ایک مشترکہ بیان انہوں نے پڑھ کر سنایا۔ ایک اخبار نویس نے سوال کیا ”کیا دونوں فریق اب مطمئن ہیں؟“

”جی ہاں مطمئن ہیں“ میں نے جواب دیا۔ پروفیسر غفور کی خاموشی کو ”نیم رضا مندی“ سمجھتے ہوئے اخبار والوں نے ان سے سوال داغ دیا، جس کے جواب میں ان کو بھی کمر پڑا کہ ”ایسی کوئی بات نہیں۔“

مذاکرات ساڑھے چار بجے شام شروع ہوئے تھے اور اس دوران وزارت داخلہ کے سیکریٹری مسز ایم کے چوہدری کو گرفتار شدگان کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے لئے ایک مرتبہ پھر طلب کیا گیا جب کہ دفاعی امور پر مشاورت کے لئے جنرل نیاالحق کو بھی بلوایا گیا لیکن انہیں بولنے کا ہمت کم موقع ملا۔ مذاکرات کا دوسرا دور ۶ جون کو شروع ہونا طے پایا تھا۔ ۳ جون کو وزیر اعظم نے میری ان تمام تجاویز کی منظوری دے دی جو میں نے اپریل میں انہیں پیش کی تھیں اور بعد ازاں جن پر کامیاب بننے بھی اتفاق ظاہر کیا تھا۔ وزارت مذہبی امور نے اسی روز اعلان کر دیا کہ اسلامی نظریاتی کونسل از سر نو تشکیل دے دی گئی ہے اور یہ چھ ماہ کے اندر اندر تمام قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈال کر حکومت کو پیش کر دے گی جس کے بعد اس کی تجویز کو قومی شکل دینے اور منظوری حاصل کرنے کے لئے قومی اسمبلی میں پیش کر دیا جائے گا۔ کونسل کے نئے چیئرمین مسز جسٹس حلیمہ مقرر کئے گئے تھے جبکہ مشیروں میں شریعت کا بچہ دمشق کے پروفیسر شیخ محمد مصطفیٰ الزرقانی، عدینہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر معروف الدوالہی، بیئرس سے ڈاکٹر محمد حمید اللہ (یہ وہی مشہور سکالر ہیں جنہوں نے جنرل نیاالحق کو وہ تقریر لکھ کر دی تھی جو انہوں نے عالم اسلام کی نمائندگی کرتے ہوئے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پڑھی تھی) جامع ازہر سے فقہ کے ایک سکالر، لیبیا سے اسلامی قانون کے ایک ماہر، ایران کی درگاہ قم سے فقہ جعفریہ کے ایک سکالر شامل تھے۔ باقاعدہ ارکان میں مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا نظام غوث ہزاروی، مولانا ظفر احمد انصاری، مولانا جمال میاں فرنگی علی، مولانا نظام مرشد، ادارہ تحفظ حقوق شیعہ کے رہنما مولانا سید الطہر حسن زیدی، علامہ نصیر الہی، مولانا خلیف ندوی، ڈاکٹر پروین شوکت علی اور مسز نظام فاروق شامل تھے۔ تین نشستیں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا مفتی محمود اور مولانا شاہ احمد نورانی کے لئے رکھی گئی تھیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی اس ہیئت سے صاف ظاہر تھا کہ اس کے اراکین اور مشیروں کی طرح ایک متفق علیہ اسلامی نظام عدل کی تشکیل پر قادر تھے۔ جس

پر اجماع امت ممکن تھا۔ لیکن افسوس کہ نظام مصطفیٰ کے نفاذ کا غرہ بلند کرنے والے قومی اتحاد نے اس وقت حقیقی نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے اس سسری موقع پر ذرا توجہ نہ دی بلکہ سوخرا لڈ کر تینوں رہنماؤں نے قومی کونسل کی رکنیت تک قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ شاید یہ ان کے ہی عدم تعاون کا نتیجہ تھا کہ بعد ازاں انہیں دس سال تک مسلسل جنرل نیاالحق کے اسلام پر دغا سننے پڑے لیکن اسلام کے نفاذ کے لئے علماء کوئی ایک قدم بھی نہ اٹھایا گیا۔

۵ جون کو مذاکرات کے دوسرے مرحلے سے ایک دن پہلے پروفیسر غفور نے پریس کلب میں صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے یہ تو بتایا کہ وہ مذاکرات کی جلد کامیابی چاہتے ہیں لیکن کیوں؟ اس ضمن میں انہوں نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ ”میں اصغر خان اور نورانی سے مشورہ کرنا تھا“

”درحقیقت انہیں مشورہ دیا تھا کہ ہمیں اصغر خان اور نورانی سے مشورہ کرنا تھا“

”خاں کو زبان بند رکھنے پر آمادہ کرنا تھا۔ ہمارے پاس اطلاعات تھیں کہ اصغر خان، بیگم نسیم ولی، سردار شیر باز مزاری اور مولانا شاہ احمد نورانی حکومت کے ساتھ کسی معاہدہ کے حق میں نہیں تھے بلکہ ان کا صدر بار بار یہی تھا کہ اب بی این اے کو مارشل لاء کا انتظار کرنا چاہئے۔ ان کا یہ اصرار ۴ جولائی کی رات بی این اے کی آخری میٹنگ تک جاری رہا جو سردار قیوم کے ہاں عشتیہ کے موقع پر ہوئی تھی اور جس میں اصغر خان اور پروفیسر غفور کے مابین سخت تلخ کاہمی ہوئی تھی۔ اصغر خان شروع دن سے مذاکرات کو سبوتاژ کرنے لپکے کوشاں تھے اور قومی اتحاد کی مذاکراتی ٹیم کو ہر میٹنگ کے بعد مطلع کرتے تھے۔ انہیں یہ بھی ملال تھا کہ انہیں نہ تو بی این اے کا سربراہ بنایا گیا اور نہ ہی مذاکراتی ٹیم میں شامل کیا گیا نہ نچوہ کھل کر کہتے تھے کہ ہم آپ لوگوں کے بھلوتے کئے گئے کسی سمجھوتے کو قبول نہیں کریں گے۔ قومی اتحاد کی مذاکراتی ٹیم اس وقت جس مشکل صورتحال سے خود اپنی صفوں کے اندر دوپہر تھی اس کی طرف سردار قیوم پروفیسر غفور اور مفتی محمود کبھی کبھار اشارہ کیا کرتے تھے۔

۱۲ جون کو دوبارہ مذاکرات گیارہ بجے دن شروع ہوئے اور تین گھنٹے تک بغیر کسی وقفے کے جاری رہے۔ بھٹو صاحب کے ساتھ حسب معمول میں اور حنیف بی زیادہ تھے جبکہ مفتی محمود کی معاونت ڈاڑھادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور نے کی۔ ان مذاکرات میں مسئلہ کے حل کیلئے دو فارمولے زیر بحث آئے جنہیں حتمی فیصلے تک پوشیدہ رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ دونوں فارمولے مسز بھٹو نے پیش کئے تھے۔ ایک میں انتخابات کے مارچ کے نتائج کو کاہم قرار دے کر از سر نو انتخابات پر اپنی آگاہی ظاہر کی تھی اور دوسرے فارمولے کے تحت متنازع نشستوں پر ”ری پولنگ“ کا آئیڈیا پیش کیا گیا تھا۔ بی این اے نے فیصلوں کی تفصیل مانگی جو اگلے دن میاں کرنے کا وعدہ کر لیا گیا۔ بی این اے کو یہ بھی بتایا گیا کہ ۱۳ جون کی بات چیت کی روشنی میں ۲ ہزار افراد ہاکے چاہتے ہیں بی این اے کا مسئلہ وہی تھا کہ کسی بھی فارمولے پر ان کی مذاکراتی ٹیم فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی چنانچہ انہوں نے دونوں فارمولے رکھ لئے تاکہ باقی رہنماؤں سے

مشورہ کر سکیں۔ سپر کورٹ پر ایف ڈی میں پروفیسر غفور نے کہا کہ..... ”کوئی غیر آئینی بات نہیں ہوگی“ تاہم میں نے ایک غیر ملکی صحافی کو اتنا ضرور بتایا کہ ”اگر کسی بھی فارمولے پر اتفاق رائے ہو گیا تو آئین میں ضروری ترمیم کر لی جائے گی لیکن ایسا دونوں فریقوں کی مکمل رضامندی ہی سے ہو گا۔“

اسی شام مسٹر بھٹو کی صدارت میں پیپلز پارٹی کے پارلیمانی گروپ کا اجلاس بھی ہوا جس میں چیئرمین نے اراکین کو مذاکرات اور اپنے فارمولوں کے بارے میں بتایا۔ اجلاس نے اتفاق رائے سے انہیں کوئی بھی فیصلہ کرنے کا مکمل اختیار دے دیا۔ کاش! یہی پوزیشن قومی اتحاد کی طرف سے مفتی محمود کو بھی حاصل ہوتی!

اسی شام قومی اسمبلی کا بجٹ اجلاس بھی شروع ہوا۔ اور میاں طفیل محمد نے جو راولپنڈی پہنچ چکے تھے سعودی سفیر کے علاوہ کویت کے سفیر یوسف عبداللطیف عبدالرزاق سے بھی ملاقات کی۔ ۷ جون کو جو مذاکرات ہوئے ان میں پی این اے نے ہمارے ویسے ہوئے دو فارمولوں میں سے اسر نوا انتخابات کا فارمولا قبول کر لیا۔ چنانچہ ری پبلک کا فارمولا ختم کر دیا گیا۔ فارمولے کی جزوی تفصیلات طے کرنے کیلئے پروفیسر غفور اور حفیظ پیرزادہ پر مشتمل سب کمیٹی تشکیل دیدی گئی جس کا کام اسر نوا انتخابات کے انتظامات اور آئین میں ضروری ترمیم کیلئے کارروائی کرنا تھا۔ سب کمیٹی کا اجلاس اسی روز ہوتا بھی طے پایا۔ مفتی محمود نواب زادہ نعر اللہ اور پروفیسر غفور نے اس دن صاف طور پر بتا دیا کہ اصغر خان کے عزائم کیا ہیں اور کس طرح ان کی صفوں میں موجود سیاستدان مارشل لاء کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس لئے معاہدے میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے مذاکرات کے بعد میں نے پی ایم ہاؤس ہی میں اخبار نویسوں کے سامنے اعلان کیا کہ کراچی اور حیدرآباد سے جزوی مارشل لاء فوری طور پر ختم کر دیا گیا ہے اور مارشل لاء کے تحت جو لوگ گرفتار کئے گئے تھے وہ رہا کئے جا رہے ہیں ان کی تعداد بارہ ہزار نو سو تھی ان پر مارشل لاء کے تحت مقدمات بھی ختم کر دیئے گئے تھے اور سزائیں منسوخ کر دی گئی تھیں مذاکرات میں اتحاد نے انتخابات اکتوبر تک کرانے کا مطالبہ کیا تھا جبکہ ہمارا متوقف تھا کہ اس کیلئے کم از کم ایک سال ملنا چاہئے تاکہ عوامی سطح پر پھیلی ہوئی نفرتوں کی گرد بجھ سکے اور انتخابات پر اسن فضا میں ہوں۔ اتحاد کے رہنماؤں کا گذشتہ شب جو اجلاس ہوا تھا، اصغر خان اس میں سرے سے شریک ہی نہ ہوئے تھے اور ان کی نمائندگی ملک وزیر علی نے کی تھی۔ وہ مذاکرات کو کوئی اہمیت دینے پر آمادہ ہی نہ تھے ان کے نزدیک اصل حل صرف مارشل لاء کا نفاذ تھا۔ انہوں نے اسی روز پشاور میں ایک پریس کانفرنس میں دھمکی دی کہ اگر تمام گرفتار شدگان فوراً رہا نہ کئے گئے تو میں اکیلا ہی ان کیلئے پوری قوت سے تحریک چلاؤں گا۔ گرفتار شدگان کی رہائی تو ایک بھانہ تھی درحقیقت وہ مذاکرات کو سبوتاژ کرنے اور پی این اے سے اپنا راستہ علیحدہ کرنے کی راہیں تلاش کر رہے تھے۔ ادھر حضرت مولانا شاہ احمد نورانی نے بھی اسی روز ہری پور دارالعلوم اسلامیہ رحمانیہ میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہہ دیا..... ”بھٹو کا استغفی ہمارا لازمی مطالبہ ہے۔“ نیز یہ کہ مذاکرات کی ناکامی کی

صورت میں تحریک پوری شدت سے چلائی جائے گی۔

یہ ایک طرف تماشہ تھا کہ مذاکراتی ٹیم بھٹو کے ساتھ انہیں وزیر اعظم تسلیم کرتے ہوئے مذاکرات زبردستی اور یہ مذاکرات ایوان وزیر اعظم میں ہو رہے تھے مفتی محمود نے بھٹو سے مستعفی ہونے کا کوئی مطالبہ نہ کیا تھا بلکہ نئے انتخابات کی جزئیات کی تیاری کا کام سب کمیٹی پر چھوڑ دیا گیا تھا لیکن اتحاد کے دو اہم اراکین مذاکراتی ٹیم سے ہٹ کر بھٹو کے استغفی اور تحریک چلانے کی باتیں کر رہے تھے۔ جس کا نتیجہ اصغر خان کو تو پانچ سال کی نظر بندی کی صورت میں بھگتنا پڑا جو ان کیلئے مارشل لاء کا تحفہ تھی اور مولانا شاہ احمد نورانی کو مارشل لاء کا خمیازہ اپنی پارٹی کی نوٹ پھوٹ کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ ظہور الحسن بھوپالی اور حاجی حنیف طیب نے انہیں ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور جماعت اسلامی کے مقابلے میں کراچی اور حیدرآباد ایسے ان کے محفوظ قلعوں میں وراڑیں پڑ گئیں۔

پی این اے نے اپنے قانونی ماہرین راولپنڈی میں سکجا کر لئے تھے جنہیں سب کمیٹی کے اجلاس سے پہلے انتخابات کے فارمولے کی ڈرافٹنگ کرنا تھی۔ ۸۔ جون کو سب کمیٹی کا اجلاس شیٹ بنک بلڈنگ میں ہوا جس میں پروفیسر غفور نے گیارہ رکنی قانونی ماہرین کی تیار کردہ رپورٹ حفیظ پیرزادہ کے سامنے رکھ دی جسے دیکھ کر وہ چکر اکر رہ گئے۔ اس میں انتخابات کے انعقاد کی تاریخ، انتخابی مشینری، الیکشن کمیشن کی نوعیت اور اس کے اختیارات، دھاندلی کے سدباب کیلئے قوانین، اسمبلیاں نوٹنے کے بعد عبوری مدت کیلئے وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے ڈھانچوں کی تشکیل اور آئین میں ترمیم تک شامل تھیں۔ حفیظ پیرزادہ نے غالباً ان مسائل پر ابھی اس قدر غور و خوض نہ کیا تھا جتنا اتحاد کی طرف سے محمود علی قصوری اور ایس ایم ظفر کر چکے تھے چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ سب کمیٹی متحدہ امور طے ہی نہ کر سکی۔ اور اختلافی امور دوبارہ اعلیٰ سطحی اجلاس میں پیش ہونے کیلئے چھوڑ دیئے گئے۔ پروفیسر غفور نے سعودی عرب اور کویت کے سفیروں سے ملاقات کر کے انہیں بھی اپنے مطالبات کی تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ جبکہ مفتی محمود نے اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ ”ضروری تحفظات کے بغیر انتخابات ہمارے لئے قابل قبول نہ ہوں گے۔“..... سانپ کے کانٹے تھے سوڑھے بھی ڈر رہے تھے۔ انہوں نے خود بھی ایک گھنٹہ تک سعودی سفیر سے ملاقات کی جس میں نواب زادہ نعر اللہ خان اور شاہ احمد نورانی ان کے ساتھ تھے۔ مذاکرات شروع ہونے کے بعد یہ ان کی شیخ ریاض المنطیب سے پہلی ملاقات تھی جس میں انہوں نے سعودی سفیر کو بتایا کہ وہ کسی صورت بھی اسمبلی کے روائی اجلاس میں شریک نہیں ہوں گے۔ مفتی صاحب نے عوام سے بھی اپیل کر دی کہ مطالبات تسلیم کرانے کیلئے جمعہ کو خصوصی دعائیں مانگی جائیں۔ ادھر شیخ ریاض المنطیب نے ساری صورت حال سے شاہ خالد کو فون پر آگاہ کیا کہ ڈور ایک مرتبہ پھر ابھتی نظر آ رہی ہے۔

سیری ذاتی رائے میں اگر حفیظ پیرزادہ اس وقت پی این اے کے قانونی ماہرین کے مقابل مات نہ کھا جاتے اور یہ ان کے معیار کو مد نظر رکھتے ہوئے خود بھی کچھ تیاری کر لیتے تو مذاکرات میں وہ ”ڈیڈ لاک“ پیدا نہ ہوتا جو ۹ جون کے مذاکرات میں پوری شدت سے ابھر کر سامنے آیا۔ اعلیٰ سطحی اجلاس میں جو اڑھائی گھنٹے جاری رہا، پروفیسر غفور اتخانی تحفظات کی اپنی پیش کردہ شقوں پر ازے رہے اور حفیظ پیرزادہ ان کی پیش کی ہوئی شقوں پر اعتراضات اٹھاتے رہے یوں اختلافات ایک مرتبہ پھر بڑھنا شروع ہو گئے حتیٰ کہ مفتی محمود نے دھمکی دے دی کہ اگر آج ہی یہ اختلافات دور نہ ہوئے تو کل ہم مذاکرات میں شریک نہیں ہوں گے وزیر اعظم بھٹو بھی ذہنی طور پر اتخانی تحفظات کی فہرست دیکھ کر الجھے سے گئے تھے۔ اس دن ماحول میں بے حد کشیدگی تھی چنانچہ جب مذاکرات کے اختتام پر مشرک پریس کانفرنس میں ایک صحافی نے مجھ سے پوچھا کہ ”اب آپ لوگ سمجھتے سے کتنے دور ہیں؟“ تو میں نے اسے یہی جواب دیا کہ ”جتنے آپ اور میں!“ صحافی مذکورہ بالا اور میرے درمیان تقریباً ۳ سو فٹ کا فاصلہ تھا۔ اس دن کے مذاکرات میں نوابزادہ نصر اللہ شریک ہی نہ ہوئے تھے۔ ان کے خیال میں حفیظ پیرزادہ معاملات کو الجھا رہے تھے اور بھٹو صاحب کو یا ”وقت گزاری“ کیلئے حفیظ کے کھیل کو طول دے رہے تھے۔ کاش اس وقت اتحاد کے مطالبہ تحفظات کو وزارت قانون میں بیٹھے بیورو کریٹس کی بجائے بھٹو صاحب بھی پارٹی میں موجود آئین اور قانون کے ماہرین پر مشتمل کسی کمیٹی کے حوالے کر دیتے تو یہ معاملہ اتنا طول نہ کھینچتا۔

تین اسی روز ملک غلام مصطفیٰ کھر نے مسلم لیگ چھوڑ کر پیپلز پارٹی میں دوبارہ شمولیت کا اعلان کر دیا اور وزیر اعظم نے انہیں فوری طور پر اپنا سیاسی مشیر مقرر کر دیا۔ انہوں نے اپنی تقرری کے بعد جو پہلا بیان دیا اس میں تمام دوستوں سے متحد ہو کر ”ملک دشمن“ قوتوں کا مقابلہ کرنے کی اپیل کی گئی تھی اور بھٹو کے ہاتھ مضبوط کرنے کیلئے کہا گیا تھا۔

مصطفیٰ کھر کے مزاج کے پیش نظر قومی اتحاد کے رہنما یکدم بدک اٹھے اور انہوں نے یہی سمجھا کہ شاید مسٹر بھٹو اب کھر کے ذریعے انہیں ہراساں کرنے کی مہم شروع کرنے والے ہیں۔ مصطفیٰ کھر قومی اتحاد کے رہنماؤں کیلئے ایک خاصا دہشت زدہ کر دینے والا نام تھا۔ انہیں شک ہوا کہ مسٹر بھٹو اب دوبارہ کھر کو میدان میں لا کر ان کے ساتھ محاذ آرائی کا کوئی نیا باب کھولنے والے ہیں، وہ اس اقدام سے اتنے الہربک ہوئے کہ جمعہ ۱۱ جون کو جب کھر نے وزیر اعظم کے خصوصی معاون برائے سیاسی امور کے عہدے کا حلف اٹھا یا تو ان کی اس تقرری کے خلاف قومی اتحاد کے رہنما انور جاوید نے لاہور ہائی کورٹ میں ۲۸ جون کو باقاعدہ ایک رٹ دائر کر دی تھی۔

بہر حال جمعہ ۱۰ جون کو مذاکرات کا پانچواں اعلیٰ سطحی اجلاس ہونے دو گھنٹے میں ختم ہو گیا اس میں قومی اتحاد نے اپنے مطالبات پر اصرار جاری رکھا جبکہ وزیر اعظم بھٹو نے چھ بنیادی اختلافات پر غور و خوض کیلئے مہلت طلب کی۔ یہ مختصر ترین اجلاس تھا جس کا مشرک بیان جو پریس کانفرنس میں پڑھ کر سنایا گیا صرف

ساڑھے تین سطروں پر مشتمل تھا طے پایا کہ چھٹا اجلاس اب اتوار کی شام کو رکھا جائے کیونکہ اگلے روز بجت اجلاس تھا شام کو اسمبلی میں وزراء کا موجود ہونا ضروری تھا۔

بفصلہ ۱۱ جون کو راولپنڈی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے اصغر خان نے دھمکی دی کہ عوام اب مذاکرات کا زیادہ انتظار نہیں کریں گے۔ انہوں نے ایک بار پھر پیسہ جام ہز نال قسم کی زبان استعمال کی۔ ادھر پروفیسر غفور نے بھی ایک پریس کانفرنس میں صورتحال پر شدید ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ مفتی محمود نواب زادہ نصر اللہ خان اور خان اشرف نے شیخ ریاض الخطیب سے ملاقات کر کے شکایت کی کہ حفیظ پیرزادہ خود مسٹر بھٹو کے ایماء پر اختلافی مسائل اٹھا رہے اور حکومت کے ارادے درست نظر نہیں آتے۔ شام کو حفیظ نے اسمبلی میں بجٹ پیش کیا شاید قومی اتحاد کی تجاویز پر عدم توجہ کی ایک وجہ بجٹ کی تیاری بھی تھی جس میں حفیظ کو بہت دقت دینا پڑا تھا۔

اتوار ۱۲ جون کو سعودی سفیر شیخ ریاض نے مسٹر بھٹو اور مفتی محمود سے الگ الگ ملاقاتیں کر کے دونوں کو فوجی فوج کو لکھو دے ”کے فارمولے کے تحت فوراً کھو دے کرنے کا مشورہ دیا۔ کویت کے سفیر نے بھی اس روز وزیر اعظم سے ملاقات کی۔ ساڑھے پانچ بجے پی این اے کی مذاکراتی ٹیم کے ساتھ چھٹا اجلاس شروع ہوا جس میں حکومت کی طرف سے قومی اتحاد کی تجاویز کا وہ جواب دیا گیا جو وزارت قانون نے ڈرافٹ کیا تھا۔ مفتی محمود نے مسودہ رکھ لیا اور بتایا کہ وہ پی این اے کے سربراہی اجلاس میں اس پر غور کر کے کل ہمیں جواب دیں گے۔ ان کے جواب پر ہی ہمارے رد عمل کا دار و مدار تھا اور کوئی حتمی فیصلہ بھی تب ہی کیا جاسکتا تھا۔ امید تھی کہ مشکل مذاکرات کا نتیجہ نکل آئے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حکومت کی جانب سے سمجھوتے کا جو دوسرا مسودہ دیا گیا، وہ ڈیڈ لاک ختم کرنے کی ایک بھری بھر پور کوشش تھی لیکن شاید قومی اتحاد کے رہنماؤں کے سربراہ اصغر خان کی دھمکیوں کی تلوار لٹکی ہوئی تھی جو وہ تمام تر جزئیات کے ساتھ اپنے مسودے کو من و عن موٹا چاہتے تھے۔ ہم پر ان کی بے بسی بھی عیاں تھی لیکن ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا۔

۱۲ جون کو حکومت نے سمجھوتے کا جو مسودہ قومی اتحاد کو دیا اس کا مکمل متن یہ تھا۔

”یہ سمجھوتہ وزیر اعظم پاکستان و چیئرمین پیپلز پارٹی مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور منتخب رکن قومی اسمبلی و صدر پاکستان قومی اتحاد مولانا مفتی محمود کے درمیان طے پایا۔ جنہیں بالترتیب آئندہ -طور میں فریق اول و فریق ثانی بیان کیا جائے گا۔ اس سمجھوتہ کا متن حسب ذیل ہے۔

جیسا کہ پاکستان کے پہلے عام انتخابات کے بعد جو مارچ ۱۹۷۱ء میں منعقد ہوئے سیاسی بحران پیدا ہو چکا ہے۔

اور جیسا کہ اس سمجھوتے کے فریق اپنی انفرادی اور نمائندہ حیثیت میں ایک پرامن حل کے متلاشی تھے اور جیسا کہ اس سمجھوتہ میں شامل فریقین کے درمیان ان کی نمائندہ حیثیت میں مذاکرات ہوئے جس

میں فریق اول کی معاونت عبدالغفور جیر زادہ اور مولانا کوثر نیازی نے کی نواب زادہ نغیر اللہ خان اور پروفیسر غفور احمد نے فریق ثانی کی معاونت کی اور جیسا کہ فریق اول نے حالات کو پر سکون بنانے اور معمول پر لانے کے لئے پاکستان قومی اتحاد کے تمام رکنوں کو باکر دینے کا حکم جاری کیا۔ کراچی ڈویژن اور لاہور اور حیدر آباد کے اضلاع سے مارشل لاء اٹھایا۔ ان تمام افراد کی اعانت کی اجازت دی جن کی جائیں ضائع ہوئیں یا شدید زخمی ہوئے گرفتار اور دفعہ ۱۳۳ کی خلاف ورزی کرنے والے تمام افراد کی رہائی کے احکامات جاری کئے ان کے ساتھ ۵۲۳ افراد کے سوا ان تمام افراد کو باکر کرنے کے احکامات بھی جاری کئے گئے جو مستعمل الزامات کے تحت زیر حراست تھے۔

اور جیسا کہ فریق ثانی نے احتجاجی تحریک معطل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی ہے جو اس نے مارچ ۱۹۷۷ء کے پسماندہ انتخابات کے بعد شروع کی تھی۔

اور جیسا کہ ریاست دارانہ، شخصیات اور عساکر سے انتخابات کے انعقاد کے لئے ضروری پُر امن اور پابندی اعتماد کا باحوال پیدا کرنے کے لئے فریقین نے یہ سمجھ لیا ہے اس سمجھوتہ کی شرائط حسب ذیل ہوں گی۔

۱۔ پاکستان کی قومی اسمبلی اور چاروں صوبوں کی صوبائی اسمبلیاں مورخہ کو توڑ دی جائیں گی۔ قومی اسمبلی اس ضمن میں ضروری ترامیم لازماً منظور کرنے کی نیز ایسے قوانین بھی منظور کئے جائیں جو اس سمجھوتہ کے نتیجہ میں ضروری ہوں گے۔

۲۔ صوبائی وزراء اعلیٰ کی سربراہی میں قائم ہونے والی حکومتیں پیرا گراف میں درج تاریخ پر کام کرنا بند کر دیں گی۔ اس کے نتیجہ کے طور پر ایسی ضروری ترامیم قومی اسمبلی میں منظور کی جائیں گی جو آئین کے آرٹیکل ۲۳۳ کے تحت حد تک قریب ترین ہوں۔

۳۔ قومی اسمبلی کے انتخابات ۷ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو منعقد کئے جائیں گے۔ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات بھی اسی دن ہوں گے۔ قومی اسمبلی کے انتخابات کے تین دن کے اندر اندر منعقد کئے جائیں گے۔

۴۔ سینٹ کے وہ اراکان جو ۵ اگست ۱۹۷۷ء کو اپنے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ اپنے عہدہ پر برقرار رہیں گے۔ سینٹ کے دیگر اراکان جنہیں قومی اور صوبائی اسمبلیوں نے منتخب کیا ہے پیرا گراف میں کے مطابق قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے بعد مستعفی ہو جائیں گے۔

۵۔ ۶ جنوری ۱۹۷۷ء کے بعد جس سماجی تحریک، مڑ بڑ اور دیگر تمام قوانین بشمول اجتماعی نظر بندی کے قوانین کے تحت گرفتار یا نظر بند کئے جانے والے افراد کو باکر دینے گئے ہیں یا انہیں فوراً باکر دیا جائے گا۔ سوائے خنزوں اور سماج دشمن عناصر کے جن پر نہایت سنگین جرائم بشمول قتل، لوٹ مار، زنا بالجبر اور آتش زنی کے الزامات قائم کئے گئے ہیں انہیں رہائش کیا جائے گا۔ تاہم فریقین کے ایک ایک نمائندہ پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی جائے گی جو ان کے خلاف الزامات کا جائزہ لے گی، کہ یہ طے کیا جاسکے کہ ان میں سے کسے رہا کیا جاسکتا ہے۔

۶۔ اس کمیٹی کے اراکان میں پیدا ہونے والے کسی بھی اختلاف رائے کو عمل درآمد کو نسل کے پاس بھیج دیا جائے گا۔

۷۔ ۱۳ مارچ ۱۹۷۷ء کے بعد رونما ہونے والی تحریک یا مڑ بڑ کے دوران متاثر ہونے والے ان تمام

افراد کو معقول معاوضہ دیا جائے گا جو شدید طور پر زخمی ہوئے جن کی جائیداد تباہ ہو گئی یا سے شدید نقصان پہنچا یا سزا کی انداز میں جان بحق ہوئے ان کے قانونی درنا کو بھی معاوضہ دیا جائے گا۔ معاوضہ کا تعین حکومت پاکستان کرنے کی ایسا معاوضہ یا امداد پارٹی کے ساتھ تعلق سے اور ابو کران تمام افراد کو دیا جائے گا جو جان بحق ہوئے جو شدید زخمی ہوئے یا ان کی جائیداد تباہ ہوئی یا سے نقصان پہنچا۔

۸۔ اس سمجھوتہ پر دستخط ہوتے ہی آئین کے آرٹیکل ۲۳۳ اور آرٹیکل ۲۸۰ کے تحت نافذ کی جانے والی پنکھی حالت فوراً ختم کر دی جائے گی۔

۹۔ سمجھوتہ پر دستخط ہوتے ہی بیننس آف پاکستان آرڈیننس ختم کر دیا جائے گا نیز اس قانون کے تحت وضع کئے جانے والے ضوابط اور احکام بھی ختم کر دئے جائیں گے تاہم اس قانون کے تحت دشمن کی جائیداد اور حصول جائیداد سے متعلق قانون اور ضابطہ برقرار رہے گا۔

۱۰۔ سمجھوتہ پر دستخط ہوتے ہی بیننس آف پاکستان آرڈیننس کے تحت قائم ہونے والے کام کرنے والے فریقوں فوراً کام کرنا بند کر دیں گے اور ان کے زیر سماعت مقدمات فوری طور پر عام عدالتوں میں منتقل کر دئے جائیں گے۔ جہاں ان پر کارروائی عام قانون کے مطابق ہوگی۔

۱۱۔ سمجھوتہ پر دستخط ہوتے ہی پاکستان آرمی ایکٹ میں ۲۱ اپریل ۱۹۷۷ء کے مطابق ترامیم جو ایکٹ ایکس ۱۹۷۷ء کے تحت کی گئیں ختم کر دی جائیں گی تاہم ان کے نتیجہ میں وہ اپیلیں متاثر نہیں ہوں گی۔ جو زیر سماعت ہوں گی یا زیر سماعت آئیں گی۔

۱۲۔ سمجھوتہ پر دستخط ہونے کے چار ماہ بعد مسلح افواج صوبہ بلوچستان میں سول انتظامیہ کی امداد کے طور پر کام کرنا بند کر دیں گی۔

۱۳۔ عوامی نمائندگی کے قانون میں حسب ذیل ترامیم کی جائیں گی۔

(۱) مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے نتیجہ میں دائر کی جانے والی اور زیر سماعت اپیلیں ختم ہو جائیں گی۔

(ب) آئندہ انتخابات کے نتائج ایکشن کمیٹی کے اعلان سے قبل ریڈیو ٹیلی ویژن سے نشر اور اخبارات میں شائع نہیں کئے جائیں گے۔

(ج) ایکشن کمیٹی مسخ افواج اور سول آرمڈ فورسز بشمول پولیس کو انتخابی مہم کے دوران اور پونگ کے موقع پر امن عامہ برقرار رکھنے کے لئے طلب کر سکے گا۔

۱۴۔ فریقین سمجھوتہ کے ایک ہفتہ کے اندر ایک ضابطہ اخلاق تیار کریں گے جس میں حسب ذیل امور شامل کئے جائیں گے۔

(۱) انتخابی مہم کے لئے قواعد۔

(ب) انتخاب کے دوران تمام قانونی سیاسی سرگرمیوں کی بارڈر ٹوک اجازت۔

(ج) انتخابی مہم کے دوران اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے قواعد کار۔

(د) آزادی صحافت جس میں ان اخبارات کے ڈیپارٹمنٹس کی بحالی بھی شامل ہے

جن کی اعانت پر پابندی عائد کی جائے۔

(ر) انتخابی مہم کے دوران اگر تکاب جرم پر کسی بھی شخص کو گرفتار نظر بند کیا جاسکے گا

اور اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جاسکے گی۔

(س) انتخابی مہم کے دوران عام جلسے منعقد کئے جاسکیں گے جلوس نکالے جاسکیں

گئے۔

(ش) سرکاری تحویل میں موجود ذرائع ابلاغ کے ذریعہ سپریم کورٹ آف پاکستان کے فیصلہ کے مطابق غیر جانبداری اور معقول توازن قائم رکھا جائے گا۔

۱۵۔ آئین پاکستان میں اس طرح ترمیم کی جائے گی کہ

(۱) شیڈول میں شہدہ ذراہیم کو آئین میں شامل کیا جائے گا۔

(ب) پیرا گراف ۱۶۔۷ اے کے مطابق الیکشن کمیشن کی تشکیل نو

۱۶۔ الیکشن کمیشن ایک چیئرمین اور چار اراکان پر مشتمل ہو گا۔ چیئرمین کے لئے وہی استیبل اور کور ہوں گی جس کا آئین کے آرٹیکل ۲۱۳ میں ذکر کیا گیا ہے ایک رکن ہائی کورٹ کا جج ہو گا۔ یہ تقرریاں صدر پاکستان فریق اول کے مشورے کر کے یا تاہم فریق اول فریق ثانی سے مشورہ کرے گا۔

۱۷۔ ایک نیا چیف الیکشن کمیشن مقرر کیا جائے گا۔

۱۸۔ اس سبجوت پر عمل درآمد کے دوران فریقین کے درمیان کوئی تنازعہ یا جھگڑا پیدا ہو جائے تو تصفیہ کے لئے عمل درآمد کونسل کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ جو پیرا گراف ۱۹ کے تحت وجود میں آئے گی۔

۱۹۔ عمل درآمد کونسل دس (۱۰) اراکان پر مشتمل ہوگی جس میں چیئرمین بھی شامل ہو گا۔ کونسل کی حیثیت اور طریق کار حسب ذیل ہو گا۔

(۱) وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کونسل کے چیئرمین ہوں گے۔

(ب) چیئرمین کی غیر حاضری کے دوران مولانا مفتی محمود اہل س کی صدارت کریں

گئے۔

(ن) مسز ذوالفقار علی بھٹو اور مولانا مفتی محمود میں سے ہر ایک چار چار افراد کونسل کے رکن

کی حیثیت سے نامزد کرے گا جو پچیسے عام انتخابات سے منتخب ہونے والی قومی اسمبلی یا پارلیمنٹ کے اراکان یا منتخب اراکان میں سے ہوں گے۔

(د) کونسل کے متفقہ فیصلہ پر فریق اول عمل درآمد کرے گا۔ اس مقصد کے لئے وزیر اعظم

کی حیثیت سے اپنے انتخابی اختیارات کو بروئے کار لائے گا۔

۲۰۔ عمل درآمد کونسل ڈینٹ دارانہ، مستغاثہ اور صاف ستھرے انتخابات کے انعقاد اور ان کی نگرانی کرے گی۔ عمل درآمد کونسل اس سلسلے میں پیدا ہونے والے معاملات یا ان سے متعلقہ معاملات پر زیادہ است یا کسی فریق کی شکایت پر کارروائی کر سکتے گی۔

۲۱۔ اگر عمل درآمد کونسل کسی متفقہ فیصلہ پر پہنچے سے تو وہ معاملہ ثالثی کے لئے سپریم کورٹ کے سامنے بھیج دیا جائے گا۔

۲۲۔ ایس تمام معاملات جو پیرا گراف ۲۱ کے تحت سپریم کورٹ کو بھیجے جائیں گے ان کے فیصلہ کے لئے چیف جسٹس آف پاکستان سپریم کورٹ کے تین ججوں کو بطور ثالث مقرر کریں گے چیف جسٹس خود اپنی ذات کو بھی بحیثیت ثالث مقرر کر سکیں گے۔

۲۳۔ چیف جسٹس کے متعین کردہ ثالث فریقین کے نامزد افراد کے موقف کی سماعت کریں گے اور ۷۲ گھنٹوں کے اندر اندر اس پر فیصلہ دینے کے ثالثوں کے روبرو تمام سماعت اور کارروائی بند کرے میں ہوگی۔

۲۴۔ ثالث کارروائی کے دوران شہادتیں قلم بند کرنے کے پابند نہیں ہوں گے نیز فیصلہ کے لئے ناسبت مختصر وجوہات تحریر کریں گے۔



نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن

سوموار ۱۳- جون کو منعقد ہونے والا اجلاس مذاکرات کیلئے فیصلہ کن موڑ کی حیثیت رکھتا تھا۔ مذاکرات واضح طور پر ناکام ہوتے نظر آ رہے تھے لیکن ہر فریق کی کوشش یہ تھی کہ مذاکرات کی ناکامی کا الزام اس کے سر نہ آئے۔ ہمارے درمیان جن امور پر اتفاق رائے ہوا ان میں ہنگامی حالت کا خاتمہ، سیاسی تبدیلیوں کی رہائی اور صوبوں میں ایسے گورنروں کی تقرریاں شامل تھیں جن پر پی این اے حکومت کے ساتھ اتفاق کرے۔ ایکشن کمیٹی کی تشکیل نو کا مطالبہ بھی مان لیا گیا تھا۔ اسمبلیاں توڑنے پر بھی اختلاف نہ تھا۔ جن نکات پر اختلاف تھا ان میں انتخابات کی تاریخ کا تعین تھا پی این اے ۲۰۰۴ء کے اندر اندر نئے انتخابات چاہتی تھی جبکہ ہمارے سامنے جو انتظامی دشواریاں تھیں ان کے پیش نظر نومبر دسمبر سے پہلے انتخابات کا انعقاد ممکن ہی نہ تھا۔ پی این اے کی مذاکراتی ٹیم کا مسند یہ تھا کہ وہ خود کوئی فیصلہ کرنے یا سمجھوتے پر دستخط کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی ہر معاملہ یہ کہہ کر مؤخر کر دیا جاتا تھا کہ ہم اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے جواب دیں گے۔ پھر وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ”ساتھیوں“ کے سامنے جانے کیلئے ان کے پاس کچھ نہ کچھ ایسی چیزیں موجود ہوں جو ساتھیوں ”اور عوام میں ان کا بھرم قائم رکھ سکیں۔ اگر یہ ”ساتھیوں کا خوف“ دامن گیر نہ ہوتا تو شاید قومی اتحاد کے رہنما بہت پہلے متفقہ سمجھوتے پر پہنچ جاتے۔

پی این اے کی مذاکراتی ٹیم کی بے بسی اس ت عیاں تھی کہ وہ پی این اے کو نسل سے جو کچھ کھوا کر لاتی تھی ”اس سے ہٹ کر کسی پہلو پر کوئی یقین دہانی ہی نہیں کر سکتی تھی ایک اجلاس کے بعد پروفیسر غفور احمد نے نہایت گلو گیر لہجے میں کہا..... ”ہم کیا کریں؟ ہمارے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ ہماری صفوں میں موجود ہارڈ لائینرز کے ہمارے ساتھ سلوک کا آپ لوگ اندازہ نہیں کر سکتے، وہ ہمیں اس طرح دیکھتے ہیں جیسے ہم آپ سے اندرون خانہ کوئی خفیہ سودے بازی کر لیں گے۔“

پی این اے کے یہ ہارڈ لائینرز سردار شیر یاز مزاری، بیگم نسیم دلی خان اور اصغر خان تھے جبکہ مولانا شاہ احمد نورانی کا وزن بھی ان کے پلڑے میں تھا۔ سردار شیر یاز مزاری، بیگم نسیم دلی خان اور اصغر خان سب سے زیادہ جن نکات کے تسلیم کئے جانے پر مصر تھے، ان میں اولیت بلوچستان سے فوج کی واپسی کو حاصل تھی جبکہ ان کا دوسرا مطالبہ حیدر آباد ٹریبونل کو ختم کر کے کملی عدالت میں دلی خان اور دیگر گروہوں کی واپسی کا اہتمام دود

مقدمہ چلانے کا مطالبہ تھا۔ پی این اے کے ۳۲ نکاتی چارٹر آف ڈیمانڈ میں یہ سب سے حساس ترین نکات تھے اور انہی دو مطالبات کی آڑ میں جرنیلوں نے شطرنج کی بساط پر اپنے مرے ترتیب دیئے ہوئے تھے۔

چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق سمیت بیشتر کور کمانڈرز حیدر آباد ٹریبونل ختم کرنے یا بلوچستان سے فوج کی واپسی کے سخت مخالف تھے۔ وہ کسی صورت بھی ان دو مطالبات کے سلسلے میں وزیر اعظم کی زبان سے یہ بات سننے پر آمادہ نہ تھے کہ وہ ان مطالبات کو تسلیم کر لیں گے۔

یہ تھا وزیر اعظم بھٹو پر اصل دباؤ! ادھر پی این اے کے ہارڈ لائینرز کا سارا اصرار بھی اس پر تھا کہ سب سے پہلے یہ دو باتیں بھٹو سے سنوائی جائیں۔ چنانچہ جب پروفیسر غفور احمد نے گلو گیر لہجے میں اپنی اس پوزیشن سے ہمیں آگاہ کیا تو مسٹر بھٹو نے انہیں کہا کہ وہ سردار شیر یاز مزاری اور بیگم نسیم دلی خان کو ان کا یہ پیغام پہنچائیں کہ وزیر اعظم ان سے تنہائی میں ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ غالباً مسٹر بھٹو انہیں علیحدگی میں یہ یقین دہانی کرنا چاہتے تھے کہ وہ ایک مرتبہ پی این اے اور حکومت کے درمیان سمجھوتے پر دستخط ہو جانے میں تاکہ ان پر سے جرنیلوں کا پریشر کم ہو سکے جو ایک طرف تو سیاسی مصالحت کیلئے زور ڈال رہے ہیں اور دوسری طرف سردار مزاری اور بیگم نسیم کے مطالبات کسی صورت بھی مسٹر بھٹو کو منظور نہیں کرنے دے رہے۔ مسٹر بھٹو کا منشاء یہ تھا کہ وہ مزاری اور بیگم دلی سے مل کر انہیں یہ باور کرائیں کہ سمجھوتے پر دستخط ہونے کے بعد ملک میں جو نئی امن وامان کی فضاء بحال ہوگی وہ نہ صرف بلوچستان سے واپس بلا لیں گے بلکہ حیدر آباد ٹریبونل ختم کر کے تمام اسیروں پر عام عدالت میں مقدمہ چلانے کا حکم بھی دے دیں گے۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک مرتبہ پی این اے کے ہارڈ لائینرز ان پر سے جرنیلوں کا دباؤ ختم ہو جائے دیں۔ مسٹر بھٹو کو بڑی شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ انہوں نے فوج کو سول انتظامیہ کی مدد کیلئے میدان میں لا کر اور جزوی مارشل لاء لگوا کر اپنے پورے دور حکومت کی سب سے فاش غلطی کی ہے۔ میں تو خیر شروع دن سے اس اقدام کے سخت خلاف تھا ہی اور میں نے اس کی بجائے ملک میں دوبارہ انتخابات کرا دینے کا مطالبہ تسلیم کرنے پر ہمیشہ زور دیا تھا حتیٰ کہ جرنیلوں کے ساتھ مختلف میٹنگوں میں بھی میں نے دوبارہ انتخابات کا مطالبہ تسلیم کرنے کی ضرورت پر زور دیا تھا جس کی جرنیلوں نے بھی مخالفت کی تھی اور حقیقتاً پیر زادہ نے بھی اور لطف یہ کہ اس سلسلے میں دونوں کے دلائل یکساں تھے کہ ”ملک میں خون خرابہ ہو گا“ لیکن یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ سندھ کے وزیر اعلیٰ غلام مصطفیٰ جتوئی نے بھی کراچی اور حیدر آباد میں جزوی مارشل لاء کے نفاذ کی شدت سے مخالفت کی تھی اور اس فیصلے سے پہلے انہوں نے کابینہ کے ایک اجلاس میں وزیر اعظم کو بتایا تھا کہ سندھ میں ایسی کمیونٹیاں توڑ رہا ہے۔ اس لئے مارشل لاء لگانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس طرح خواہ مخواہ جرنیلوں کو سیاست میں ملوث ہونے اور سیاسی اقتدار کا ذائقہ چکھنے کا موقع ملے گا۔ لیکن اس وقت وزیر اعظم کو جرنیلوں اور خصوصاً ”چیف آف آرمی سٹاف“ پر کھل بھروسہ تھا، خصوصاً اس وقت تو ان کا اعتماد دو

چند ہو جاتا جب ہنزلی ضیاء الحق اپنے مخصوص دھیسے بلکہ عاجزانہ انداز میں انہیں فوج کی اور اپنی وفاداری کا کمال یقین دلاتے ہوئے گویا عظیم اس جال میں پھنس چکے تھے اور خوبصورت الفاظ کا یہ تار عنکبوت ان کو پوری طرح اپنے حصار میں لے ہوئے تھا لیکن کبھی کبھی جرنیلوں کی بدلتی ہوئی آنکھیں انہیں شک و شبہ میں بھی مبتلا کر دیتیں، لگتا تھا جوتی کے مشورے کی اہمیت اب ان پر واضح ہو چکی تھی۔ اور اسی لئے اب وہ ٹیکم نسیم ولی خان اور مزاری کو یہ پیشکش تک بھجوا رہے تھے کہ ملک میں امن و امان بحال ہوتے ہی نہ صرف ان کے دونوں مطالبات تسلیم کر لئے جائیں بلکہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ان کی توڑی ہوئی حکومتیں بھی بحال کر دی جائیں گی لیکن اب نسیم ولی خان مزاری ان سے بات تک کرنے پر آمادہ نہ تھے چنانچہ جب انہوں نے پروفیسر غفور کی پیغام رسانی سے ہلی این ایسے کی ہائی کمان کو آگاہ کیا تو اصغر خان نے انہیں سختی سے بھٹو صاحب سے ملنے سے منع کیا۔ ادھر مفتی محمود کو بھی یہی پوزیشن اختیار کرنا پڑی اور انہوں نے بھی مزاری اور ٹیکم نسیم کو مسز بھٹو سے ملنے سے روک دیا اور مسز بھٹو کے سامنے ان دونوں کے مطالبات کو ان سے کہیں زیادہ شدت سے پیش کر دیا کہ جب تک بلوچستان سے فوج کی واپسی اور حیدر آباد نریوئل کے خاتمے کے بنیادی مطالبات تسلیم نہیں کئے جاتے کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکے گی۔ یہ ۱۳ جون کے مذاکرات کا سب سے سنگین موڑ تھا۔ مذاکرات کے اختتام پر ماحول نہایت کشیدہ تھا۔ چیئرمین بھٹو نے اس روز پارٹی کے کارکنوں کو ملک بھر میں کنونشن منعقد کرنے کی ہدایات جاری کرویں اور پارٹی کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر غلام حسین کو حکم دیا کہ وہ ۱۸ جون کو لاہور میں ۲۱ کو کوئٹہ میں ۲۶ کو پشاور میں ۲۸ کو ملتان اور ۸ جولائی کو کراچی میں پارٹی کنونشنوں کی صدارت کریں۔ بھٹو اس اقدام کے ذریعے اپنی ”عوامی قوت“ کا مظاہرہ کر کے جرنیلوں کو متنبہ کرنا چاہتے تھے اور یہ بتانا چاہتے تھے کہ وہ عوام میں اب بھی اس قدر مقبول ہیں کہ جب چاہیں ’عوامی قوت‘ کے بل بوتے پر اپنی کرسی کی طرف دیکھنے والوں کو پھیل دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن بھٹو بھول رہے تھے کہ اب وہ ملک غلام مصطفیٰ کھراہیے منتظم اور باصلاحیت دوست سے محروم تھے۔ جس نے تین تینا پیپلز پارٹی کی عوامی قوت کے زور پر پولیس کی بڑتال کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی اور پوری بیوروکریسی کے علاوہ اقتدار کی خواہشمند دوسری قوتوں کو بھی اپنے اپنے بلوں میں سرچھپانے پر مجبور کر دیا تھا۔ لہٰذا ہلی این ایسے کے دوسرے وزیروں اور لیڈروں میں ملک غلام مصطفیٰ کھرنے کی نہ تو صلاحیت تھی اور نہ بیوروکریسی کے جال میں گھر کر بھٹو اب اس عوامی قوت کے مالک رہے تھے جو انہیں اقتدار میں لے کر آئی تھی۔ رہی پیپلز پارٹی جو بحیثیت ”پارٹی“ اسے کبھی منتظم ہی نہ کیا گیا تھا۔ نہ کسی بھی سطح پر اس میں انتخابات کرانے کے حقیقی رہنماؤں کو ابھرنے کا موقع دیا گیا تھا۔ بس نامزد کیا گیا ہی نامزد کیا گیا۔ اور نامزد لوگ کبھی کارکنوں یا عوام کی پروا نہیں کیا کرتے۔ ان کی مثال تو ان ملازمین کی ہی ہوتی ہے جو اپنے مالک کے اشارے پر تاپتے ہیں اور کبھی نہیں دیکھتے کہ مالک کیلئے سرانجام دیا جانے والا کون سا کام جائز ہے اور کون سا ناجائز، کیونکہ انہیں احتساب کا خطرہ تو ہوتا نہیں۔ اس سبب سے پارٹی کے نامزد امیدوار بھی تحریک کے مقابل غائب ہو چکے تھے اور وہ خاندانوں کے ذریعے اسمبلیوں میں چننے والے

”عوامی نمائندوں“ کی اکثریت بھی اس قابل نہ تھی کہ اپنے حلقہ ہائے انتخابات کو قابو میں رکھ سکتی۔ پاکستان پیپلز پارٹی ہمیشہ سے ووٹرز کا ایک جہوم رہی تھی جو مسز بھٹو کی پرسکش شخصیت کے سحر کا امیر تھا۔ اور حقیقت بحیثیت پارٹی اس کا کوئی وجود ہی عرصہ اقتدار میں باقی نہ رہا تھا اور وزیر اعظم کو اس کا احساس ہو رہا تھا کہ پارٹی کو منظم کرنا کس وجہ ضروری تھا۔ دودھ دینے والے نامزد مجنوں میدان سے راہ فرار اختیار کر چکے تھے اور مسز بھٹو کا اقتدار پوری طرح جرنیلوں کے رحم و کرم پر یا ہلی این ایسے کے ساتھ جلد سے جلد سمجھوتہ کر لینے پر منحصر تھا۔“

۱۳ جون کو آٹھویں اجلاس سے پہلے مسلح افواج کے سپریم کمانڈر اور وزیر اعظم پاکستان ڈاکٹر افتخار علی بھٹو نے ہلی این ایسے۔ ایم۔ ہاؤس میں منعقد ہونے والی فوجی حکام کا اجلاس طلب کیا ہوا تھا۔ حسب معمول میں اور حفیظ ان کے ساتھ تھے۔ پہلے تو وزیر اعظم نے کور کمانڈرنٹ سے دفتری انداز میں ان کے علاقوں کی صورت حال پر بات چیت کی اور پھر نہایت خود اعتمادی کے ساتھ انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ میری یادداشتوں میں درج ان کی تقریر کی ابتدا اس جملے سے ہوئی تھی۔ COUNTRY IS AT THE CROSSROAD ”کنٹری از ایٹ دی کراس روڈ“ (ملک اس وقت دورا ہے پر کھڑا ہے) پھر انہوں نے مختصراً جرنیلوں کے ساتھ کانفرنسوں کے جواز پر روشنی ڈالی اور انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ان پر بھروسہ ”بے دست و پا“ ہو کر نہیں کیا جا رہا ہے۔ مسز بھٹو نے کہا تھا (اور نیچے دیا ہوا ایک ایک لفظ ان کا ہے) کہ

”میں اپنے اختیارات کو خوب جانتا ہوں اور یاد رکھیں کہ میں آرمی کو آرڈر کر سکتا ہوں۔ میں نے ریفرنڈم کے سلسلے میں آپ سے مشورہ کیا، لیکن صرف اس لئے کہ اگر آپ کسی حل کو مناسب نہیں سمجھتے تو میں اسے مسلط نہیں کرنا چاہتا کیونکہ اس طرح صحیح نتائج پیدا نہیں ہوں گے۔ میں قومی CONSENSUS چاہتا ہوں اور آپ بھی قوم کا حصہ ہیں۔ دوسرے مجھے اپنے بارے میں کوئی کامپلیکس نہیں، مجھے آرمی جرنیلوں سے بات کرتے ہوئے اس لئے جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ میں پچھلے دس سال سے آپ لوگوں کو جانتا ہوں۔ مجھے آپ سے مشورہ کرتے ہوئے کوئی الجھن نہیں ہوتی جب میں نے ریفرنڈم کے سلسلے میں آپ حضرات سے بات کی تو ممکن ہے آپ لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ میں اور طاقتور بن کر ابھروں گا۔ آپ لوگوں نے سیاسی تعغیر چاہا، میں نے کہا..... آل رائٹ..... آپ میں سے ہر ایک مذاکرات کے لئے پر جوش تھا، چنانچہ میں نے سختی کے ساتھ بات چیت کے پہلے ہی روز واضح کر دیا کہ کسی فیصلے کی بات نہیں کر رہا، آپ لوگ ہمارے بزرگ اور بھائی ہیں میں انتہا پسند نہیں، لیبرل ہوں، مجھے ان کی باتیں ماننے میں ایک منٹ نہیں لگا، میں نے ہر مطالبہ مان لیا، اب چاہے مجھے اس کی کتنی ہی بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ میں نتائج پیدا کرنے پر قادر نہیں۔ آنے والے الیکشن کے نتیجے میں جو مذاکرات کی کامیابی کے بعد ہوں گے، تضادات مضر پیدا ہوں گے۔ امن میں عدم استحکام آئے

گا۔ لیکن ایک بات طے ہے ایکشن کے بعد آرمی کی مداخلت کوئی بھی پسند نہیں کرے گا۔ کیونکہ ان کے پاس تازہ سینڈسٹ ہو گا اور وہ اتنی جلد ایکس پوز بھی نہ ہوں گے گو وہ ”بھتا“ کی طرح آپس میں لڑیں گے اور یہ ٹک کے لئے بہت برا ہو گا۔ مگر آرمی کچھ نہ کر سکے گی، مگر ایک راستہ یہ ہے کہ آرمی اب فیک اور کر لے لیکن یہ کوئی ”بیڈ آف روز“ BED OF ROSES (پھولوں کی بیج) نہیں ہے، جب بجی نے فیک اور کیا اور میں اس سے ملتا تو میں نے اس پر واضح کیا تھا کہ تم خطرناک پوزیشن میں ہو، اس نے کہا ”پالیٹکس کیا ہے؟ کامن سینس! اور یورو کسکی کہتی ہے کہ آپ میں سیاسی بصیرت ہے، آپ کامن سینس کے مالک ہیں، اس لئے حکومت چلا سکتے ہیں“ لیکن وہ ۱۹۶۹ء تھا اب ۱۹۷۷ء ہے۔ میں نے اس وقت بھی کہا تھا کہ دوسرا مارشل لاء پہلے سے کمزور تر ہوتا ہے۔ اور تیسرا اس سے بھی کمزور ہو گا۔ کمزور ان سٹوڈنٹس کے اول تو آپ کسی کوشش نہ کریں گے اور اگر کریں گے تو سمجھ لیں کہ یہ بدترین کمزوری ہے۔ آج دنیا بھر میں بیداری ہے۔ یہ بھی کہا جائے گا کہ پنجابی آرمی حکومت کر رہی ہے۔ دوسرے صوبے کٹ جائیں گے۔ کشمیر کی سیز فائر لائن کے لئے آپ پر دباؤ ہو گا۔ ایشی ری پریزیٹنگ پلانٹ کے مسئلے پر آپ مصیبت میں ہوں گے۔ ان معاملات سے صرف سیاسی حکومت نمٹ سکتی ہے۔ آرمی نہیں! بڑی طاقتیں یہ سوال بھی اٹھائیں گی کہ آبادی کے تناسب کے لحاظ سے پاکستان میں باغیہ کے مقابل ”ریٹو آف فورسز“ (افواج کا تناسب) اتنا زیادہ کیوں ہے؟ لیکن میں یہ نہیں کہہ رہا کہ میں اکیلا ہی سارے مسائل کا حل ہوں..... نہیں..... میں اپوزیشن سے بات کر کے ایک با عزت حل ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس میں کامیاب ہو جاؤں گا“

وزیر اعظم کی اس تقریر کے ایک ایک لفظ سے ایک تجربہ کار ڈپلومیٹ کا طرز گفتگو جھلک رہا تھا۔ انہوں نے بڑی کامیابی سے اپنا مافی بعصر جرنیلوں کے ذہنوں میں اتارا تھا اور میں نے دیکھا کہ جرنیل ان کی تقریر کے بعد گنگ سے تھے۔ چند لمبے کے سکوت کو چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیا الحق کے الفاظ نے توڑا۔

”سرا! آپ نے آرمی کے لئے سب سے زیادہ کام کیا ہے، آرمی کوئی تھرڈ پارٹی نہیں۔ ہمارا ایسا کوئی ذہن نہیں۔ آپ نے تو دیکھا ہے کہ ہم نے اپوزیشن کیپ میں ”بیڈ نیم“ (BAD NAME) حاصل کیا ہے، یہ ہمارا کریڈٹ ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہم حکومت کے ساتھ ہیں“

ان کے خاموش ہوتے ہی لاہور کے کور کمانڈر جنرل اقبال بولے۔ ”فوج مذاکرات کی کامیابی کے لئے دماغ رک رہی ہے، ایچی ٹیشن ہو گئی طور پر رک گیا ہے لیکن اگر مذاکرات ناکام ہوئے تو یہ پھر شروع ہو گا، ہم بلاسٹ ہوں گے، فائرنگ ہوگی، ڈیمو کریٹک پوٹھ فورس اصغر خان سے ہدایت لے رہی ہے، فوج کو لاہور میں دوبارہ تعین کرنا ممکن نہ ہو گا، لوگ اسے قبول نہ کریں گے۔ ایکس ٹریٹل تھرٹ EXTERNAL THREAT بھی ہوں گے۔ اعزین آرمی ہماری سرحدوں میں آ سکتی ہے۔ اوھر ہمارے پونٹ شہر کے

اندر مصروف ہوں گے“ ہم نے آرمی کو شوٹنگ کے لئے کہا تو اس میں کریکس CRACKS اٹھے اور یہ بھی عجیبہ ہو گا کہ آرمی میں باہمی عداوتی شروع ہو جائے۔ اپوزیشن کافی عرصہ سے اس سلسلے میں کام کر رہی ہے۔ ریشاڈ فنی افسر ایچی ٹیشن میں شریک ہیں۔ پھر فوجیوں کے رشتہ دار ہیں۔ انتخابی مہم بھی جو نیٹز سٹارٹ انداز ہوئی ہے، فائر ان دی ایئر (FIRE IN THE AIR) آرمی میں نہیں ہوتا، لیکن ہمارے ہاں احکامات کے باوجود ہوا۔ اس لئے ہم دل و جان سے مذاکرات کی کامیابی چاہتے ہیں۔“

جنرل اقبال خاموش ہوئے تو کراچی کے کور کمانڈر جنرل ارباب جمان زیب بولے۔ ”ہر شخص مذاکرات کی کامیابی چاہتا ہے۔ چاہے وہ کسی صورت میں بھی ہو ہماری حالت اس وقت یہ ہے کہ بالکل فحلی سطح پر ہمارا اب کوئی اثر نہیں رہا۔

جنرل افسر جو ہیں THEY WILL OBEY US BUT UNWILLINGLY

سینٹرنل، کوئی پرابلم نہیں ہے، مگر سیاسی تعفیہ وہ بھی چاہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو آرمی گلیوں میں نہ جا سکتے گی۔ دونوں طرف کے لوگ مسلح ہیں۔ اگر ڈیڈ لاک ہوتا ہے تو دونوں کو DIS ENGAGE کرنے کی ضرورت ہوگی۔ ایرانی سائڈ تو ہم نہیں دیکھ سکتے، لیکن بلوچستان میں کوئی TROUBLE نہیں ہوگی۔ سندھ میں اگر ایچی ٹیشن میں رورل RURAL ایر یا شامل ہو گیا تو بہت مشکل پیدا ہوگی۔ مذاکرات میں کامیابی آپ کسی بھی طرح حاصل کریں۔ لیکن حیدر آباد کے قیدی رہائیں ہونے چاہیں۔ کیونکہ وہ لوگ مسلح وطن دشمن اور نڈر ہیں!“

جنرل جمان زیب کے خاموش ہونے پر جنرل غلام حسن گویا ہوئے۔ ”مذاکرات کی کامیابی کے لئے بھی دعا کر رہے ہیں INTEGRITY PROLONG INVOLVEMENT آرمی کی کے خلاف ہے۔ اب ایچی ٹیشن شروع ہوا تو زیادہ شدید ہو گا اور ایکس ٹریٹل تھرٹ اس کے علاوہ ہے۔

آخر میں گفتگو کو سمیٹتے ہوئے مسٹر بھٹو نے کہا..... ”گو یا یہ بات اب واضح ہو گئی کہ آپ اکارڈ ACCORD چاہتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہم سیاسی حل نکال لیں گے، آپ لوگ بھی دعا کریں“

شام پانچ بجے مذاکرات شروع ہوتے تھے۔ مثنیٰ محمود نے بتایا کہ پی۔ این۔ اے کے نزدیک انتخابات ۱۳ اگست سے قفل ہو جانا چاہیں اور کل ہم آپ کو اس کی حتمی تاریخ سے بھی آگاہ کر دیں گے۔ از سر نو انتخابات کے سلسلے میں دونوں فریقوں کے درمیان اتفاق رائے تھا، اختلاف صرف تاریخ اور وقت کے تعین پر تھا۔ یہ امر طے پا گیا کہ تمام گرفتار شدگان کھجوتے کے ساتھ ہی رہا کر دیئے جائیں گے۔ ہم نے تجویز پیش کی کہ انتخابات کی تاریخ رمضان المبارک کے بعد رکھی جائے۔

پی۔ این۔ اے کی مذاکراتی ٹیم کو ساری روواہائی کمان کے سامنے رکھنا تھی، چنانچہ اجلاس اگلے

روز شام تک ملتوی ہو گیا۔

رات کو سعودی سفیر شیخ ریاض العنقیب نے وزیر اعظم بھٹو سے ملاقات کی اور مذاکرات میں مثبت پیش رفت پر اطمینان کا اظہار کیا۔
مفتی محمود صفائیوں کے گھیرے میں آگے اور انہیں کسنا پڑا کہ ہم انتخابات کا انعقاد ۱۳ اگست سے پہلے چاہتے ہیں، انتخابات کی تاریخ کے بارے میں آج فیصلہ کر کے کل حکومت کو آگاہ کریں گے، تاہم ابھی کوئی حتمی سمجھوتہ نہیں ہوا ہے۔



سترہواں باب

ڈیڈ لاک ہوتا ہے۔

۱۵ جون بدھ کا اجلاس ہر اعتبار سے اطمینان بخش تھا۔ جس کے اختتام پر پی ایم ہاؤس کے آؤٹوریم میں پروفیسر غفور احمد کی معیت میں میں نے پریس بریفنگ کے دوران وہ تفصیلات بتائیں جن کے نتیجے میں بحران کے حل کیلئے حکومت اور قومی اتحاد کے درمیان سمجھوتہ طے پا گیا تھا۔ سمجھوتے کی مختصر تفصیلات بتاتے ہوئے میں نے کہا کہ عام انتخابات اکتوبر میں ہوں گے اور اس سلسلے میں فنی توضیحات کے تعین کیلئے حفیظ پیرزادہ اور پروفیسر غفور پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کر دی گئی ہے۔ سمجھوتے پر عملدرآمد ایک دس رکنی کونسل کرائے گی جس میں بی این اے اور پیپلز پارٹی کے پانچ پانچ نمائندے ہوں گے۔ اگر کونسل کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہو گیا تو فیصلہ سپریم کورٹ کے تین ججوں کا پینل کرے گا۔ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات قومی اسمبلی کے انتخاب کے بعد ہوں گے۔ سمجھوتے پر دستخط کے دن سے ہنگامی حالت ختم ہو جائے گی خصوصاً ٹریبونل ختم کر دیئے جائیں گے (حیدر آباد ٹریبونل ان میں شامل تھا) بلوچستان سے فوج واپس بلائی جائے گی، بنیادی حقوق کے منافی آئینی ترامیم بھی غیر مؤثر ہو جائیں گی۔ تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے جائیں گے۔ اخبارات کو مکمل آزادی حاصل ہوگی ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر فریقین کو مساوی وقت دیا جائے گا۔ سمجھوتہ پر ۲۰ جون تک دستخط ہو جائیں گے۔ پیرزادہ اور پروفیسر غفور اپنے چار چار قانونی ماہرین کی مدد سے سمجھوتے کا مسودہ تیار کریں گے اور سمجھوتے پر مسز بھٹو اور مولانا مفتی محمود کے دستخط ہوں گے۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ سب کمیٹی کا پہلا اجلاس کل ۱۶ جون کو گیارہ بجے اسلام آباد میں ہو گا۔

جب میں یہ تفصیلات بتاؤں تو ایک صحافی نے سوال کیا۔

”کیا آزاد کشمیر کے بارے میں بھی کوئی فیصلہ ہوا؟“

”جی ہاں“..... پروفیسر غفور احمد نے جواب دیا

”اس بارے میں سردار عبدالقیوم سے عنقریب بات چیت شروع کر دی جائے گی“..... میں نے مزید

وضاحت کی۔

”کیا انتخابات کی تاریخ طے پاگئی ہے؟“ ایک اور صحافی نے سوال کیا

”جب سمجھوتہ طے پا گیا تو سب کچھ ہو گیا“..... میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا آپ سمجھتے سے مطمئن ہیں؟ سوال پروفیسر غفور سے تھا۔

”اگر مطمئن نہ ہوتے تو سمجھو کہ کس طرح ہوتا؟“۔ انہوں نے جواب دیا

”آپ کا کیا خیال ہے، سمجھو ان سے زبردستی کرایا گیا ہے؟“۔ میں نے سوال کرنے والے سے ہنستے ہوئے سوال کیا۔ پروفیسر غفور بولے۔ ”آپ اخبار والے بھی حد کرتے ہیں۔ آج ایک اخبار نے لکھا ہے کہ ہم اٹھ کر جا رہے تھے۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔“ میں نے بھی اس کی تردید کی اور کہا کہ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ پروفیسر غفور سے ایک اور صحافی نے پوچھا:

”کیا آپ نے حکومت کی تجاویز قبول کر لی ہیں؟“۔

انہوں نے زیادہ تفصیلات ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے کہا ”یار! آج زیادہ سوالات نہ کریں“

”ہم اپنے لئے نہیں سات کروڑ عوام کیلئے یہ سوال کر رہے ہیں۔ جو جاننا چاہتے ہیں کہ آخر آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟“ صحافی نے اصرار کیا۔

”لیکن تمام تفصیلات طے ہونے سے پہلے ہم کوئی اعلان نہیں کریں گے“۔ پروفیسر غفور احمد

بھی اڑ گئے۔

”کیا انتخابات سال کے آخر میں ہوں گے؟ گھما پھرا کر سوال پھر کیا گیا۔

”کیا عبوری حکومت کا معاملہ ختم ہو گیا۔“ ”جی ہاں“۔ میں نے مختصر جواب دیا

”جی ہاں ختم ہو گیا۔“ پروفیسر غفور احمد نے بھی اختصار کے ساتھ جواب دیا۔

”کیا انتخابات کا تعین ہو چکا ہے؟“۔ ایک اور صحافی نے پھر وہی سوال کیا۔

”ہاں بھئی ہو چکا ہے۔“ پروفیسر غفور قدرے بیزار کی حالت میں بولے۔ اور اس کے ساتھ میں نے صحافی دوستوں سے اجازت طلب کی۔

ہم آج کی ساری کارروائی سے بے حد مطمئن تھے کیونکہ تمام معاملات براہ حسن و خوبی انجام پانچکے تھے اور یہ ہمارے لئے انتہائی مسرت کا مقام تھا کہ قوم کو ایک بڑے بجران سے نکالنے میں ہماری حقیر کوششیں بار آور ہونے کو تھیں۔

ادھر ہم مطمئن و مسرور تھے، ادھر امین خان نے اسی شام موجودہ رکن قومی اسمبلی ملک محبوب حسین کی رہائش گاہ پر ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے معاہدہ پر اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ کیا انہوں نے کہا کہ وہ اس سمجھوتے پر خوش نہیں ہیں۔ عوام کو تفصیلات بتائے بغیر سمجھوتے کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ تفصیلات طے ہونے میں مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔

یوں لگتا تھا جیسے آئندہ پیدا کرنے کیلئے مشکلات کا تعین بھی انہوں نے کر لیا ہو۔

ادھر پاکستان کے مخلص دوست سعودی عرب کے سفیر شیخ ریاض المظہب کا انداز ملاحظہ ہو۔ جن سے ہمارا کوئی رشتہ نہ وطن کے حوالے سے تھا نہ رنگ و نسل کے حوالے سے..... سواتے اس کے کہ وہ

ہمارے مسلمان بھائی اور پاکستان کیلئے دل درد مند رکھنے والے شخص تھے۔ انہوں نے سمجھوتے طے پانے کے بعد کہا..... ”میں اتنا خوش ہوں کہ اس خوشی کے اظہار کیلئے مجھے الفاظ نہیں مل رہے یہ میری سفارتی زندگی کا سب سے اہم اور مقدس ترین مشن تھا۔ غوا کا شکر ہے کہ دونوں فریقوں نے شاہ خالد کی بزرگی کا لحاظ کیا ہے اور ان کی تجاویز کو قبول کر لیا ہے۔“

رات کو مفتی محمود کے اعزاز میں ملک منسوب حسین نے عشاء یہ دیا تھا جس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے بھی اعلان کیا کہ سمجھوتے پر دو تین دن میں دستخط ہو جائیں گے۔

اعصاب پر تو ہم سب ہی کے یکساں بوجھ تھا۔ لیکن وزیر اعظم، منو تمام معاملات کے بخیر و خوبی انجام تک پہنچ جانے کے بعد جیسے اچانک ہی ٹوٹ سے گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اسی شام مفتی محمود کو تھانیا تھا کہ اب وہ تین چار روز تک صحت مند اتارنے کیلئے لاڈ کاندہ جا کر آرام کریں گے اور یہ بات ہماری موجودگی ہی میں ہوئی جس پر مفتی محمود نے ان سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا تھا کہ انہیں ضرور آرام کرنا چاہئے کیونکہ مسودے کی ڈرافٹنگ میں تین چار دن ویسے بھی لگ جائیں گے۔

بجرات ۱۶ جون کو سٹیٹ بینک بلڈنگ میں پیرزادہ اور پروفیسر غفور کے ساتھ چار چار قانونی ماہرین کی سب کمیٹی کا دو گھنٹے طویل اجلاس ہوا جس میں سمجھوتے کو تحریری شکل دینے سے متعلق تمام ابتدائی تفصیلات طے کر لی گئیں، مفتی محمود اس روز بیٹوں چلے گئے تھے جہاں انہوں نے مسجد جعفر خان میں ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے قوم سے اپیل کی کہ غیر ذمہ دارانہ باتوں سے پرہیز کیا جائے، ورنہ ملک بڑے سنگین بحران سے دوچار ہو جائے گا لیکن عین اسی روز صوبائی میں ایک بڑے جلسہ عام سے این ڈی پی کے صدر سردار شیراز مزاری نے بھی خطاب کیا اور کہا کہ ۳۳ نکات کی منظوری سے ہم پر سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ سمجھوتے کے بعد اس طرح کی باتیں کرنے سے ان کا کیا مقصد تھا البتہ پروفیسر غفور احمد ہمیں بتایا کرتے تھے کہ تحریک استقلال کے امین خان این ڈی پی کی بیگم نسیم ولی خان اور کسی حد تک جے یو پی کے مولانا شاہ احمد نورانی کا موقف یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کی حکومت سے کوئی معاہدہ کرنے کی بجائے ملک میں مارشل لاء لگوانے کی کوشش کی جائے۔ پروفیسر غفور نے تو امین خان سے یہ بات تک منسوب کی تھی کہ وہ فوجی حکام کے ذریعے مارشل لاء کے بعد نوے دن کے اندر انتخابات کرانے کے دعوے کر رہے ہیں اور کسی قیمت پر پیپلز پارٹی کی حکومت کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کرنا چاہئے۔ اب جبکہ ان تمام حضرات کی آراء نے علی الرغم سمجھوتہ ہو گیا تھا تو پروفیسر غفور کی باتوں کی روشنی میں مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے پی این اے کی صفوں میں کچھ لیڈر واقعی ایسے ہیں جن کے جرنیلوں سے تعلقات ہیں اور وہ لوگ تقریباً وہی بات جلسہ عام میں کرتے ہیں جو جرنیل صاحبان میں منگولوں میں ستر، بھونو کے سامنے رکھتے ہیں۔ جرنیلوں کے عزائم کم از کم میں ہمزور محسوس کر چکا تھا اور میں نے وزیر اعظم کو بھی اپنے محسوسات سے آگاہ کر دیا تھا، ادھر پی این اے کے رہنماؤں کے بارے میں خود پی این اے کے جنرل سیکرٹری یہ بتا چکے تھے کہ وہ بھی مارشل لاء کا راستہ ہموار

کر رہے ہیں جو داخلی مصلحتوں میں مذاکراتی ٹیم کے رکن حفیظ پیرزادہ کا رویہ مجھے بے حد تشویش ناک لگتا تھا۔ میرے خیال کے مطابق مذاکراتی ٹیم میں اگر وزیر اعظم پیرزادہ کی جگہ رفیع رضا کو اپنے ساتھ رکھتے تو وہ ان کی قانونی معاونت بھی بہتر طور پر کر سکتے تھے۔ اور ان کا رویہ بھی بے حد ستمی اور سنجیدہ ہوتا۔ وہ پیرزادہ کی طرح رومانی فکر کے مالک نہ تھے اور بھٹو صاحب کیلئے بے حد تخلص بھی تھے۔ بد قسمتی یہ تھی کہ وزیر اعظم نامعلوم وجوہ کی بناء پر ان سے کچھ بدظن سے نظر آنے لگے تھے حتیٰ کہ کئی مرتبہ انہوں نے واضح طور پر یہ تک کہہ دیا تھا کہ رفیع رضائی آئی اے کے ایجنٹ ہیں اور پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے متعلق امریکہ کو انہوں نے آگاہ کیا تھا۔ میرے نزدیک رفیع رضائی ایسے محبت وطن انسان سے اس اقدام کو منسوب کرنا ایک نہایت سچے اور صحیح اور تخلص دوست سے کوئی مناسب سلوک نہ تھا۔

ملتی محمود اور دیگر لوگوں کے علم میں بھی تھا کہ مسٹر بھٹو محکمہ اتارنے کیلئے لاڑکانہ جانا چاہتے ہیں لیکن اچانک جمعرات ۱۶ جون کو انہوں نے اعلان کیا کہ وہ لاہور کو پانچ مسلم ہالک کے دورے پر ان کے سربراہوں کا شکر یہ ادا کرنے جا رہے ہیں۔ ان کا یہ دورہ کئی اعتبار سے کثیر القاصد تھا۔ ایک طرف جہاں وہ ان دوستوں کو براہوں کا شکر یہ ادا کرنا چاہتے تھے جنہوں نے پاکستان کے سیاسی بحران کے حل کے سلسلے میں دلچسپی لی۔ وہاں دوسری طرف وہ امریکہ کو بھی یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ داخلی محاذ پر جنگ انہوں نے جیت لی ہے اور اب وہ امریکہ کی جانب سے ایٹمی پروگرام کے سلسلے میں حائل کردہ تمام رکاوٹوں کو ایک ہی ٹھوک سے گرانے والے ہیں اور فنڈز اکٹھا کرنے چلے ہیں۔ انہیں قطعاً پروا نہیں کہ امریکہ اس سلسلے میں کیا اقدامات کر رہا ہے۔ تیسری طرف وہ جرنیلوں کو بھی یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ عالمی سطح پر اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر وہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ جرنیل اگر اپنے دماغ میں کوئی غلط خیال رکھتے ہیں تو اس اہمیت کو بد نظر رکھیں۔ جو انہیں بعد ازاں بے حد شواہروں سے دوچار کر سکتی ہے۔

جو تھی جانب وہ اپنی این اے کے رہنماؤں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ ان ایسی سطح کے آوی نے اپنی این اے کے ”کنوٹس کے مینڈکوں“ کو کتنی حیثیت دی ہے۔ اس سے زیادہ کی طلب انہیں نہیں کرنی چاہئے۔

اس حقیقت کے حال پر ان کے کرم کا یہ عالم تھا کہ جب انہوں نے اپنے بیرون ملک جانے کا اعلان کیا تو اسی پریس کانفرنس میں بطور خاص اس بات کا ذکر کیا کہ ”کوٹنیازی نے تری جمانی کا حق ادا کر دیا ہے“ میں ان کی صلاحیتوں کا مداح ہوں“ انہوں نے پروفیسر غفور کے رویے کی بھی تعریف کی۔

ادھر ملک غلام مصطفیٰ کھر نے اسی روز وزیر اعظم کے خصوصی معاون برائے سیاسی امور کا عہدہ سنبھال لیا، جس سے پٹیل این اے کے رہنما تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ چیف آف آری سٹاف جنرل ضیاء الحق بھی اسی روز ایک دن کے دورے پر کراچی پہنچے جہاں لفٹیننٹ جنرل ارباب جہانزیب نے ان کا استقبال کیا۔ وہ اسی شام واپس راولپنڈی چلے آئے۔ ان کے ساتھ اس دورے میں مجر جنرل ایس ایم عباسی بھی تھے۔

اگلے روز جمعہ ۱۷ جون کو وزیر اعظم بھٹو جرنیلوں اور قومی اتحاد کے رہنماؤں کو ان کے حال پر چھوڑ کر سعودی عرب ’یلیا‘ کویت ’ابو ظہبی‘ اور ’امیر ان کے پانچ روزہ دورے پر نکل کھڑے ہوئے اپنی این اے کے مطالبات میں ایک حصہ آزاد کشمیر سے متعلق بھی تھا کہ وہاں بھی از سر نو انتخابات کرائے جائیں۔ چنانچہ وزیر اعظم بھٹو نے اس سلسلے میں فیصلہ کیا تھا کہ میں سردار عبدالقیوم کے ساتھ میٹنگ کر کے ان کے مطالبات سنوں اور جو فیصلہ مناسب سمجھوں کر لوں۔ میں نے اس معاملے میں کسی تاخیر کے بغیر سردار قیوم کو دعوت دی کہ وہ میری رہائش گاہ پر مجھ سے مل لیں۔ چنانچہ سردار قیوم جمعہ ۱۷ جون کو ہی سردار سکندر حیات سمیت تشریف لے آئے اور صرف ڈیڑھ ہی گھنٹہ میں مختلف امور پر اتفاق رائے پیدا کر کے اٹھے۔ آزاد کشمیر میں بھی نئے انتخابات اکتوبر ہی میں ہونے کا طے پا گیا۔ آزاد کشمیر ایکٹ میں چند ترامیم چاہتے تھے جن پر وزیر اعظم ہی فیصلہ لے سکتے تھے چنانچہ میں نے ان سے ترامیم کا مسودہ لے کر رکھ لیا تاکہ مسٹر بھٹو کی واپسی پر ان سے اس پر تبادلہ خیال ہو سکے۔ اس وجہ سے ان کے ساتھ ایک اجلاس کا ہونا اور طے پایا۔

ادھر پیرزادہ اور پروفیسر غفور پر مشتمل سب کمیٹی کے اجلاس میں ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا جس پر حفیظ نے کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے سے انکار کر دیا اور پروفیسر غفور پر واضح کر دیا کہ وہ ان کے ”سنے“ مطالبے کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ ”نیا مطالبہ“ فقط اتنا تھا کہ اپنی این اے سے اس سمجھوتے کا آئینی تحفظ چاہتی تھی اور اس کیلئے آئین میں ایک عبوری شیٹ کا اضافہ چاہتی تھی۔ ہوا یہ کہ جب مذاکراتی ٹیم نے سمجھوتے کا مسودہ پٹیل این اے کی ہائی کمان اور لیگل ایڈوائزرز کے سامنے رکھا تو اس پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا گیا کہ اس سمجھوتے کی کوئی آئینی حیثیت نہیں ہے اور اگر مسٹر بھٹو کل کا اس سے منحرف ہو جاتے ہیں تو کوئی ان کا کیا باز لے گا۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ سمجھوتے میں جو کچھ طے پایا اگر اس کی آئینی حیثیت کو سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا جاتا ہے تو اس کا مستقبل کیا ہو گا؟۔ چنانچہ طے پایا کہ اس مقدمے کے حصول کیلئے حکومت سے سمجھوتے کیلئے آئینی تحفظ کا مطالبہ کیا جائے۔

حفیظ پیرزادہ نے ان مطالبات پر سخت رویہ اختیار کیا اور پروفیسر غفور کو صاف جواب دے دیا کہ اس بات کو تسلیم کرنا ان کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ آخری لمحات میں مسٹر بھٹو کی بیرون ملک روانگی کے بعد پیدا ہونے والا یہ وہ ”ڈیڈ لاک“ تھا جس نے سارے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ اگر اپنی این اے کے قانونی مشیر سمجھوتے کے سلسلے میں آئینی تحفظ مانگتے تھے تو یہ کوئی ایسی بری بات نہ تھی جب ساری باتیں خلوص نیت سے طے پا گئیں تو اس میں بھی کوئی حرج نہ تھا کہ سمجھوتے کو آئینی تحفظ فراہم کر دیا جاتا۔ پیرزادہ کے انکار نے مسٹر بھٹو پر اپنی این اے کے اعتماد کو ختم کر کے رکھ دیا چنانچہ جمعہ ۱۷ جون ہی کو پروفیسر غفور نے اعلان کر دیا کہ یہ معاملہ اعلیٰ سطحی اجلاس میں پیش کیا جائے گا۔ انہوں نے مسٹر بھٹو کے بیرون ملک جانے پر بھی تنقید کی۔ ان کا اور اپنی این اے کے دیگر رہنماؤں کا خیال یہ تھا کہ بھٹو سمجھوتے کے سلسلے میں تخلص نہیں ہیں اس لئے وہ حفیظ پیرزادہ کو یہ فرض سوچ گئے ہیں کہ وہ سمجھوتے کو سبوتاژ کر

ہفتہ ۱۸ جون کو مسٹر بھٹو نے ریاض پہنچ کر شاہ خالد سے ملاقات کی، اسی روز طرابلس روانہ ہو گئے۔ ادھر میرے اور سردار عبدالقیوم کے درمیان مذاکرات میں آزاد کشمیر ایکٹ پر غور ہوا، اجلاس میں آزاد کشمیر کے چیف سیکرٹری اور سیکرٹری قانون بھی موجود تھے۔ یہ مذاکرات ایک گھنٹہ تک جاری رہے اور طے پایا کہ متعلقہ افسروں کو سردار قیوم کے مطالبات کو قانونی شکل دینے کیلئے کچھ وقت دیا جائے اور پھر مشکل کو ہمارے درمیان مذاکرات ہوں۔ آزاد کشمیر پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کا مطالبہ تھا کہ ان مذاکرات کے سلسلے میں ان کی رائے بھی سنی جائے۔ ورنہ ان کی حیثیت آزاد کشمیر میں سخت متاثر ہوگی۔ چنانچہ میں نے شام کو پیر علی جان شاہ سے بھی ملاقات کی اور انہیں یقین دلایا کہ وہ پریشان نہ ہوں، اگر انہوں نے عوام کیلئے خدمات سرانجام دی ہیں تو لوگ انہیں فراموش نہیں کریں گے، نئے انتخابات کی تیاری کریں۔

حافظ پیرزادہ نے اسی روز جلتی پر اور تھل چمڑک دیا۔ انہوں نے لاہور میں پارٹی کے کنونشن سے خطاب کیا جس میں پی این اے کو مشتعل ہونے کا ایک اور موقع مل گیا۔ حافظ نے کہا، ہم نے گورنروں کی تقریر ان کے مشورے سے کرنے کا مطالبہ مسترد کر دیا ہے۔ اب کیا مان لیا ہے؟ اور کیا مسترد کر دیا ہے؟ قسم کی باتیں کرنے کا وقت نہ تھا لیکن کچھ سمجھ نہیں آسکا کہ آخر حافظ ایسی باتیں کیوں کر رہے تھے؟ سردار قیوم نے اس امر پر اپنی تشریح کا اظہار بھی کیا تھا۔

سردار صاحب کا خیال تھا کہ اگر پیرزادہ صاحب ہمارے چند مطالبات مسترد کرنے کا اعلان کر سکتے ہیں تو ہم بھی عوام کو یہ بتانے کے لئے آزاد ہیں کہ وہ مسٹر بھٹو جو اسمبلیاں توڑنے کی بات سننا گوارا نہیں کرتے تھے، ان سے ہم نے سب کچھ چھین لیا ہے۔ پارٹی کا وہ کنونشن زبردست ہنگامہ آرائی کا شکار ہو گیا تھا اور ایک طالب علم رہنما ذوالفقار زلفی کو بھی اس میں بے حد زد و کوب کیا گیا۔

اتوار ۱۹ جون کو مسٹر بھٹو طرابلس پہنچے اور صدر قذافی سے ملنے کے بعد اسی روز ابو ظہبی پہنچ گئے لیکن یہاں پروفیسر غفور احمد نے پشاور پہنچ کر بیان دے دیا کہ حکومت کے رویے نے فضا خراب کر دی ہے۔ نیز یہ کہ اب غیر معینہ عرصہ تک سمجھوتے پر اختلافات برداشت نہیں کئے جائیں گے۔ ادھر نوابزادہ نصر اللہ خان نے لاہور میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ گورنر کی تقریر ہمارے مشورے سے کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ سمجھوتے کے بارے میں غیر یقینی فضا پیدا کی جا رہی ہے۔ اصغر خان نے کہا کہ عوام کے مطالبات تسلیم ہوئے بغیر حکومت سے سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ حکومت ویسے بھی تاخیری حربے اختیار کر رہی ہے سردار عبدالقیوم نے کھل کر حافظ پیرزادہ پر تنقید کی اور الزام عائد کیا کہ وہ ”خفیہ اشاروں“ پر سمجھوتے کو سبوتاژ کرنا چاہتے ہیں لیکن ہم عوامی تحریک کو سبوتاژ نہیں ہونے دیں گے۔

سوموار ۲۰ جون کو شام ۶ بجے پیرزادہ اور پروفیسر غفور پر مشتمل سب کمیٹی کا اجلاس جس ماحول میں ہوا ہو گا، ان بیانات کی روشنی میں قارئین خود ہی اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں پروفیسر غفور کو بجا طور پر پیر

زادہ سے شکایت تھی کہ ان کے رویے اور بیانات سے پی۔ این۔ اے ہائی کمان کے سامنے پی۔ این۔ اے کی مذاکراتی ٹیم کی پوزیشن مجروح ہوئی ہے۔

پیرزادہ نے جو باعزیدہ جارحانہ انداز اختیار کیا جس سے چڑ کر پروفیسر غفور یہ کہتے ہوئے اجلاس سے اٹھ گئے کہ ”اب آپ سے کوئی بات نہیں ہو سکتی، مسٹر بھٹو آئیں گے تو انہیں سے بات ہوگی۔“ سردار عبدالقیوم اور میرے درمیان آزاد کشمیر کے سلسلے میں جو سمجھوتہ ہوا تھا، وہ بھی حافظ پیرزادہ کے درشت رویے کی نذر ہو گیا اور سردار عبدالقیوم نے پریس کانفرنس میں اعلان کر دیا کہ حافظ پیرزادہ جان بوجھ کر مذاکرات کو سبوتاژ کر رہے ہیں اور اگر پی۔ این۔ اے اور حکومت پاکستان کے درمیان سمجھوتہ نہیں ہوتا تو ہم آزاد کشمیر کے سلسلے میں بھی کسی سمجھوتے کو تسلیم نہیں کریں گے۔ انہوں نے اسی روز راولپنڈی میں طلباء کے ایک استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے یہ سفسٹی خیز بیان بھی دیا کہ حکومت نے پی۔ این۔ اے کے بعض رہنماؤں کو قتل کرانے کی سازش کی ہے جن میں اصغر خان، شاہ احمد نورانی اور شیراز خان مزاری شامل ہیں۔ اسلام آباد میں مفتی محمود نے کہا کہ اتحاد سے مشورے کے بغیر بھٹو کو باہر نہیں جانا چاہئے تھا اور ویسے بھی مجھ سے انہوں نے لازماً نہ تک جانے کی بات کی تھی۔ سمجھوتے کے بارے میں اب پیرزادہ سے کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے عوام سے اپیل کی کہ اگر جمعہ تک سمجھوتے پر دستخط نہیں ہوتے تو جمعہ کو ملک بھر میں یوم احتجاج منایا جائے۔

بھٹو اس روز متحدہ عرب امارات سے کویت پہنچے تھے۔ انہوں نے ابو ظہبی، دبئی ویرمن کو ایک طویل انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ حکومت اور اتحاد کے مابین اکتوبر میں انتخابات کا سمجھوتہ ہو چکا ہے، نیز پاکستان ہر قیمت پر ایٹمی ری پریسنگ پلانٹ حاصل کر رہے گا۔ انہوں نے تیسری اسلامی سربراہ کانفرنس بلانے کی تجویز بھی پیش کی اور شیخ زید بن سلطان کے ساتھ اپنی بات چیت کو بے حد مفید قرار دیا۔

مجھ سے اسی روز آزاد کشمیر کے صدر سردار ابراہیم سپیکر فضا خان، پیپلز پارٹی کے صدر پیر علی جان شاہ، اور ممتاز راٹھور نے وفد کی صورت میں ملاقات کی اور شکایت کی کہ سردار قیوم کے ساتھ سمجھوتے کے بعد ان کا کیا بنے گا؟ میں نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ سمجھوتے میں آپ کی آڑ نہ نظر رکھی جائیں گی۔ چوہدری نور حسین اور عبدالحمید خان نے بھی مجھ سے الگ الگ ملاقاتیں کیں۔ ان کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ سمجھوتہ صرف سردار قیوم کی آڑ اور مطالبات کی روشنی میں نہ کیا جائے۔

مجھے اس صورت حال کے پیدا ہونے کا کلام تھا جس کا باعث حافظ پیرزادہ بنے تھے اور جس کے سبب ملک میں تھی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی تھی چنانچہ میں نے پریس کے ذریعے اتحاد کے رہنماؤں سے اپیل کی کہ سمجھوتے کے سلسلے میں بیان بازی کے اس افسوس ناک سلسلے کو بند کر دیں۔ میں نے کہا کہ یہ کسی فریق کی شکست یا دوسرے کی فتح نہ تھی بلکہ درحقیقت جمہوریت کی فتح تھی۔ میں نے اتحاد کے رہنماؤں کو یقین دلایا کہ سمجھوتے سے انحراف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر سمجھوتہ سبوتاژ ہوا تو یہ ملک و قوم کے لئے نیک فال نہ ہوگی..... میرا یہ بیان ریکارڈ پر موجود ہے۔

شام کو میرے اور سردار قیوم کے درمیان مذاکرات کا آخری دور ہوا جس میں یہ طے پا گیا کہ آزاد کشمیر میں انتخابات ۱۰ اکتوبر کو ہوں گے، تاہم پی۔ این۔ اے کا مطالبہ جو انہوں نے ذرا نکھری ہوئی شکل میں میرے سامنے پیش کیا، یہ تھا کہ دس رکنی عمل درآمد کونسل کی آئینی حیثیت کا تعین کیا جائے چونکہ براہ راست اس معاملے کا آزاد کشمیر سے کوئی تعلق تھا اور نہ اسے تسلیم کرنا میرے دائرہ کار میں شامل تھا، اس لئے میں نے ان سے درخواست کی کہ اس معاملہ کو وہ مسز بھٹو کے لئے چھوڑ دیں، کیونکہ حفیظ پیرزادہ جنہیں اس قسم کے آئینی معاملات پر فیصلے کرنا تھے، ان سے توہی۔ این۔ اے نے بات ہی ختم کر دی ہے چنانچہ اس فیصلے کے بعد ہمارے درمیان مذاکرات ختم ہو گئے۔

منگل ۲۱ جون کو مسز بھٹو نے تہران میں سابق شاہ ایران سے ملاقات کی اور ایک پریس کانفرنس سے بھی خطاب کیا جس کے بعد وہ کابل روانہ ہو گئے انہوں نے امیر کویت سے ملاقات کے بعد کویت ہی میں یا سرعرات سے بھی ملاقات کی تھی اور امریکہ و اسرائیل کی بعض دیکھی رگوں کو چھینا تھا۔ ادھر پروفیسر غفور احمد نے بھی اسی صبح اسلام آباد میں کویت کے سفیر سے ملاقات کی اور انہیں قتل کے اسباب اور صورت حال سے آگاہ کیا۔ سفیر موصوف نے انہیں تسلی دی کہ یہ معمولی مسئلہ ہے۔ جسے مسز بھٹو کی وطن واپسی پر آسانی سے نئے کر لیا جائے گا۔

۲۳ جون جمعرات کو وزیر اعظم بھٹو اپنے چھ روزہ غیر ملکی دورے کے بعد کابل سے اسلام آباد پہنچے تو ایئر پورٹ ہی پر انہوں نے حفیظ پیرزادہ سے پوچھا کہ ان کے پیچھے یہ کیا ننگا۔ انھ کھڑا ہوا ہے۔ حفیظ نے کچھ وضاحت کرنا چاہی لیکن اس دوران مسز بھٹو کو صحافیوں نے آلیا جن میں غیر ملکی صحافیوں کی کثیر تعداد بھی شامل تھی۔ صحافیوں کا پہلا سوال ہی ان سے سمجھوتے کے بارے میں تھا..... جس پر مسز بھٹو نے بڑی لاچارگی کے سے عالم میں انہیں جواب دیا.....

”اب میں کیا بتاؤں؟ میں تو جب گیا تھا، سمجھوتہ ہو چکا تھا، مجھے نہیں معلوم کہ میرے پیچھے کیا ہو گیا ہے۔ صورت حال کا جائزہ لے کر ہی کچھ بتا سکوں گا۔“

ان کی واپسی کے فوراً بعد پی۔ ایم۔ ہاؤس میں مفتی محمود، نواب زادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور پر مشتمل پی۔ این۔ اے کی مذاکراتی ٹیم اور ہمارے مابین بات چیت شروع ہو گئی جو تقریباً ہونے دو گھنٹے تک جاری رہی۔

اس بات چیت میں پی۔ این۔ اے کی ٹیم نے سمجھوتے کا ایک اور ہی مسودہ حکومت کے سامنے رکھ دیا جس میں عمل درآمد کونسل کی تشکیل، اس کے اختیارات، اس کی حیثیت کا آئینی تعین اور اسمبلیاں توڑنے کی تاریخ کے تعین کی بات کی گئی تھی۔ مسز بھٹو نے یہ مسودہ دیکھنے کے بعد جو قانونی موٹکائیوں کا ایک شاہکار تھا، اپنا سر پکڑ لیا اور مفتی محمود سے جواب دینے کے لئے اگلے روز کی ملت طلب کی۔ مذاکرات کے اختتام پر میں نے صحافیوں کو بتایا کہ حتمی سمجھوتہ جلد ہو جائے گا اور اسے تحریری شکل بھی دے دی جائے

گی۔ میں نے کہا کہ سمجھوتہ نہ ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

قومی اتحاد کے نئے مسودے میں وہ سب کچھ شامل تھا جس کی طرف شاید انہیں حفیظ پیرزادہ ہی نے اپنی تقاریر اور بیانات کے ذریعے خیال دلا یا تھا۔ مثلاً ان کا مطالبہ تھا کہ چاروں صوبوں میں حکومتیں توڑ کر فوری طور پر گورنرانج قائم کیا جائے اور گورنروں کا تقرر پی۔ این۔ اے کے مشورہ سے ہو۔

۲۱ جون جمعہ کو شیخ ریاض المصطیب نے ڈیڑ لاکھ کی اس صورت حال پر مفتی محمود، نواب زادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور کے ساتھ تقریباً ۲ گھنٹے تک گفتگو کی اور انہیں یقین دلا یا کہ مسز بھٹو سمجھوتے کے بارے میں سنجیدہ ہیں۔ وہ مسز بھٹو کے دورہ سعودی عرب کے موقع پر سعودی عرب گئے تھے۔ اور اگلے ہی روز پاکستان واپسی کے بعد انہوں نے رابطوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ جب کہ ۲۵ جون کو حکومت اور پی۔ این۔ اے کی ٹیموں کے درمیان مذاکرات کا گیارہواں اجلاس ہونا تھا۔



فیصلہ سُن موڈ سنی خیز لمحات

۲۵ جون ہفتہ کی صبح وزیر اعظم نے اپنے دفتر میں چیف آف آرمی سٹاف سمیت جملہ کور کمانڈرز کا اجلاس طلب کیا جس میں حفیظ پیرزادہ، میں اور جنرل نکا خان بھی موجود تھے۔ مسز بھٹو نے پی۔ این۔ اے کا تازہ مسودہ جرنیلوں کے سامنے رکھا اور ان سے اس پر رائے طلب کی۔ ایک جنرل نے مسودے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تو بالکل اس طرح ہے جیسے جنرل اروڑہ نے جنرل نیازی سے سریندر کی دستاویزات پر دستخط کرنے کو کہا ہو۔“

ایک اور جنرل نے شق وار مسودے کا مطالعہ کرنے کے بعد کہا.....

”یہ تو سپر گورنمنٹ کی تشکیل کے لئے کیا جا رہا ہے۔“

ایک جنرل کا فرمان تھا.....

WE HAVE SERIOUS OBJECTIONS
ON SOME CLAUSES

وزیر اعظم نے کہا.....

”دیکھ لیجئے، میں حیدر آباد ٹریبونل بھی ختم کرنا ہو گا اور بلوچستان سے فوج بھی واپس بلانا پڑے گی۔“

اس پر جنرل ضیاء الحق پر جوش لہجے میں بولے.....

”یہ نہیں ہو سکتا سر! آپ مجھے موقع دیجئے کہ اس مسئلے پر وہ میری بات سنیں۔“

مسز بھٹو نے کہا.....

”ٹھیک ہے ہم آپ کو بلوائیں گے آپ انہیں آرمی کمانڈ نظر سنائیں کہ اس میں کیا مشکلات ہیں، دفاع اور ملکی سالمیت کے کون کون سے پہلو اس سے متاثر ہوتے ہیں۔“ وہ جنرل ضیاء الحق کی اس پیشکش پر خاصے خوش نظر آتے تھے۔

جنرل نکا خان نے اس میٹنگ کے دوران اپنی وہ اہم تہہ تجویز پیش کی تھی جس کا ذکر جنرل ضیاء الحق

نے متعدد مواقع پر کیا ہے ان کا فرمان تھا.....

”سر! ہم تو بولنا کہ ان کا پانچ چھ ہزار آدمی صاف کر اویٹے ہیں..... یہ لوگ ٹھنڈا ہو کر گھر بیٹھے جائے گا۔“ جنرل ضیاء الحق کے بقول ہمیں سے ان کے ذہن میں بھٹو حکومت کے خاتمے کا خیال پیدا ہوا تھا کیونکہ بھٹو حکومت ملک میں خون خرابہ کرانے پر تلی ہوئی تھی، حالانکہ میٹنگ میں مسز بھٹو سمیت حکومت کے کسی اور رکن نے نکا خان کے خیالات کی تائید نہیں کی تھی۔

مسز بھٹو نے جرنیلوں کو آخر میں بتایا کہ ہم نے بھی اپنا کارڈ تیار کیا ہے اور ہماری کوشش یہی ہوگی کہ پی۔ این۔ اے اور اپنے کارڈ کو سامنے رکھ کر کوئی مشرک فارمولہ وضع کیا جائے انہوں نے کہا کہ شام کے اجلاس میں وہ بھی اپنا کارڈ پی۔ این۔ اے کے سامنے رکھیں گے۔ اس کے بعد میٹنگ ختم ہو گئی۔

سواد گھنٹے جاری رہنے والے اس گیارہویں اجلاس میں مسز بھٹو نے سمجھوتے کے لئے اپنا دہرا ترسیم شدہ مسودہ پیش کر دیا۔ دونوں مسودوں کو سامنے رکھ کر تفصیل سے شق وار گفتگو ہوئی اور متفقہ شقوں کو تازہ شقوں سے الگ کر لیا گیا۔ بحث کا زیادہ حصہ عمل درآمد کو نسل کی ہیبت محسوس پر صرف ہوا تھا۔ مسز بھٹو نے مفتی محمود کو بتایا کہ ان کے مسودے کی بعض شقوں پر آرمی معترض ہے اور اس سلسلے میں چیف آف آرمی سٹاف ان کے سامنے ”آرمی کانٹھ نظر“ بیان کرنا چاہتے ہیں۔

۲۶ جون اتوار کا دن اس اعتبار سے اہم تھا کہ مفتی محمود نے ایک باقاعدہ پریس کانفرنس کی صورت میں حکومت کو انتباہ دیا کہ آئینی تحفظات کے بغیر انتخابات کا بائیکاٹ کیا جائے گا اور ہم اپنے موقف کی وضاحت کے لئے دوست عرب ممالک میں اپنے خصوصی ایجنٹی بھیجیں گے۔

پروفیسر غفور احمد کے لہجے میں اس سے زیادہ تلخی تھی، ان کا کہنا تھا کہ

”اتحاد کا حتمی مسودہ آج حکومت کو پیش کر دیا جائے گا، چاہے وہ اسے قبول کرے یا نہ کرے، ہم اب مزید انتظار نہیں کر سکتے، عمل درآمد کو نسل کے سلسلے میں ہمارا موقف تبدیل نہیں ہو گا اور اب اگر مذاکرات ناکام ہوتے ہیں تو ہم ایک مرتبہ پھر جیل جانے کے لئے تیار ہیں ہماری آج کی دستاویز حکومت کے لئے آخری الٹی میٹم ہوگی۔ ہم تمام مسودے دو تین دن میں اشاعت کے لئے اخبارات کو جاری کر دیں گے اور مرکزی رہنما اپنے اپنے شہروں کو روانہ ہو جائیں گے۔“

لاہور میں مسجد شہداء کے باہر بیگم نسیم ولی خان اور سردار شیراز مزاری نے بھی ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے حکومت کی نیت پر بڑے جذباتی حملے کئے جس کے نتیجے میں سنت نگر میں اتحاد اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے مابین مسلح تصادم ہو گیا جس میں ۸ افراد زخمی ہوئے۔ صورت حال ایک بار بھر دوپہن نظر آنے لگی تھی۔ جہاں ۱۶ مارچ ۱۹۷۷ء کی پی۔ این۔ اے کی تحریک کے وقت تھی۔

۲۷ جون سوموار کو حفیظ پیرزادہ نے پروفیسر غفور سے ملاقات کر کے پی۔ این۔ اے کا حتمی مسودہ وصول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میں الٹی میٹم یاد دہشکی کے تحت مسودہ وصول نہیں کروں

گا۔ ان کا صرار تھا کہ اتحاد اپنا الٹی میٹم واپس لے اور نہ مذاکرات نہیں ہو سکتے۔ مفتی محمود نے ان کے اس بیان کے بعد کہا۔

”پیر زاوہ کا بیان حکومت کی طرف سے مذاکرات کی ناکامی کا اعلان ہے۔“

اصغر خان نے بھی پیر زاوہ پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے ان کے بیان کو افسوس ناک قرار دیا۔

ماحول سخت کشیدہ ہو چکا تھا۔

۲۸ جون منگل کو وزیر اعظم نے اسمبلی چیمبرز میں ایک ہنگامی پریس کانفرنس سے خطاب کیا اور اپنے موقف کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔

”میں سپر گورنمنٹ قبول نہیں کروں گا۔“ یہ وہی ترکیب تھی جو ۲۵ جون کی مینٹگ میں ایک جنرل نے استعمال کی تھی۔ پی۔ این۔ اے کے عمران عمل در آمد کو نسل کو حکومت سے زیادہ اختیارات دینا چاہتی ہے، سمجھوتہ اگر ہو گا تو آئینی تقاضوں کے مطابق اور نہ نہیں ہو گا، تعطل بڑھے گا تو بات تمام ہی سیاستدانوں کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ پی۔ این۔ اے کو حکومت میں شامل کرنے کا مطالبہ میں تسلیم نہیں کروں گا۔“ مجھے حکومت کی کوئی پروا نہیں..... میں ہر وقت لاڈ لکانہ جانے کے لئے تیار ہوں، پھر چاہے فرشتے آئیں..... یا کوئی راسپوٹن! اور سرمایہ داروں کی تو ایسی چڑی ادھیڑوں کا کہ ان کی آنے والی نسلیں تک یاور نہیں گی۔“

مجھے یاد ہے ان کی اس پریس کانفرنس کے بعد شیخ ریاض المخطیب نے ان سے ملاقات کر کے انہیں جذباتی نہ ہونے کا مشورہ دیا تھا۔

اصغر خان نے مسز بھٹو کی تمام باتوں کا جواب اسی روز نیکسٹ میں ایک بڑے جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے دیا اور آخر میں یہ دھمکی بھی دی کہ

”اب ہمارا مطالبہ وزیر اعظم کا استعفیٰ ہو گا۔“

ادھر پتلی پارٹی کا حال یہ تھا کہ وزیر اعظم کے ایما پر بلائے جانے والے ملتان کنونشن میں کارکنوں نے ایک دوسرے پر ہی کرسیاں اور جھانچلائے۔ ناصر علی رضوی اور ڈاکٹر غلام حسین جو پارٹی کے ڈپٹی سیکرٹری اور سیکرٹری جنرل تھے مجھے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے پارٹی کے کارکنوں اور رہنماؤں کو صورت حال کی سنیغنی کا ذرا بھی احساس نہ تھا کہ وہ کس منہ زور سیلاب کے دھارے کی راہ میں کھڑے ہیں اور کوئی دم جاتا ہے کہ پانی ان کے سروں سے گزر جائے گا۔ وہاں اب بھی ایک دوسرے پر الزام تراشیاں گالی گلوچ اور شکوک و شبہات کے اظہار کا سلسلہ جاری تھا۔

شیخ ریاض المخطیب کی ملاقاتوں کا اس دن یہ مثبت نتیجہ نکلا کہ مسز بھٹو نے ٹیلی فون پر مفتی محمود سے بات چیت کی اور انہیں اگلے روز یعنی بدھ ۲۹ جون کو ملاقات کی دعوت دی۔ بھٹو صاحب نے مفتی

صاحب کو یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ اتحاد کے کسی رہنما کو گرفتار نہیں کیا جائے گا اور کل انشاء اللہ سمجھوتہ ہو جائے گا۔

قومی اتحاد کے رہنماؤں کا مرکز جناب ارشد چوہدری کی قیام گاہ تھی۔ آئی۔ ڈی نے اطلاع دی وہاں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ قومی اتحاد کے رہنما اسلام آباد سے اپنے اپنے شہروں کو لوٹ جائیں گے مگر جناب ریاض المخطیب کی کوششوں سے ان کی یہ روانگی ٹرک گئی اور ۲۹ جون کو پرائم منسٹراؤس میں مسٹر بھٹو اور مفتی محمود کے درمیان ایک گھنٹہ تک مذاکرات ہوئے، جن میں کوئی معاون شریک نہ تھا، ان مذاکرات میں طے پایا کہ پیر زاوہ اور پروفیسر غفور پر مشتمل سب کمیٹی اتحاد کے سودے پر غور کرے گی اور اپنی اپنی تجاویز مذاکراتی ٹیموں کے اجلاس میں پیش کرے گی۔ سب کمیٹی کا اجلاس ۳۰ جون جمعرات تک جاری رہا اور پیر زاوہ اور پروفیسر غفور نے بغیر کسی اتفاق رائے کے اپنی اپنی تجاویز اور اعتراضات کے نوٹس بتائے جو اگلے روز یکم جولائی کو مذاکراتی ٹیموں کے آخری اجلاس میں پیش ہونے لگے۔ مسز بھٹو مفتی محمود کے ساتھ اپنی ملاقات میں انہیں قائل کر چکے تھے کہ وہ بعض امور پر آرمی کا نقطہ نظر بھی کل سن لیں جس کے بعد وہ خود فیصلہ کریں کہ کون سا مطالبہ ملکہ و قوم کے حق میں مفید ہے اور کون سا غیر مناسب۔

یکم جولائی کو مذاکرات پی۔ ایم ہاؤس کے کیمپنٹ روم میں صبح ساڑھے دس بجے شروع ہوئے۔ آرمی کا نقطہ نظر پیش کرنے کے لئے مسلح افواج کے سربراہوں کی اعلیٰ درجہ کرکٹس منٹ پر شروع ہوئی۔ اس سے پیشتر مسز بھٹو اتحاد کے سودے کا مطالعہ کر کے مفتی محمود اور ان کے دونوں معاونین کو بتاتے رہے کہ بعض شہوں پر آرمی معترض ہے اور ہمیں آرمی سے مصالحتانہ انداز اختیار کرنا ہو گا۔

تقریباً سو بار بیکے جنرل ضیاء الحق مینٹگ روم میں داخل ہوئے۔ جنرل ضیاء الحق کے ہمراہ ایک نوجوان اور بھی تھا جس نے بغل میں کچھ نقشے، ہارکے تھے۔ جنہیں اس نے نہایت احتیاط کے ساتھ دیوار پر لٹکا دیا۔ یہ نوجوان خالد محمود عارف تھے۔ تین سنجیدہ اور خاموش طبع عارف پورے اجلاس کے دوران ایک مرتبہ بھی نہیں بولے اور خاموشی سے مختلف چہروں کا جائزہ لیتے رہے۔ ہم نے انہیں جنرل ضیاء الحق کے ساتھ پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ خالد محمود عارف مجھے فوجی جرنیل کم انشور اور افلاہ غازی اور نظر آتے تھے۔ اس امر کا باقاعدہ انکشاف بہت عرصہ بعد ہوا کہ وہ شعر بھی کہتے ہیں اور سچ جانتے شعر کہتے ہیں۔

جنرل ضیاء الحق نے اپنی منگ سنبھالی اور اس کی نوک نقشے کے مختلف مقامات پر رکھ کر پاکستانی فوج اور سرحدوں سے باہر غیر ملکی زردیں کے بارے میں بتانے لگے۔ فوجی نقطہ نظر سمجھاتے سمجھاتے اچانک جنرل ضیاء الحق نے ملکی سیاسی بحران اور اس کے اثرات و مضمرات پر لیکچر دینا شروع کر دیا اور سیاسی منافست کی ضرورت پر زور دیا جس پر لواب زاوہ نصر اللہ خان برفروختہ ہو کر بولے

”ہمیں آپ سے سیاسی وعظ نہیں سنتا، ہم سیاست کو خوب سمجھتے ہیں اگر آپ اپنا یا آرمی کا فوجی

ان کی برفروختی دیکھ کر جنرل ضیا الحق ششدر سے ہو گئے ماحول کشیدہ ساہو چلا تھا مگر بھٹو صاحب نے اپنی ڈپلومیٹک مہارت سے اسے ٹھنڈا کر دیا تھوڑی دیر کے بعد جنرل بھی اجلاس سے چلے گئے اور اجلاس آٹھ بجے رات پر ملتوی ہو گیا۔

مجھے اسی سہ پہر راولپنڈی میں اقلیتوں کی ایک ریلی سے خطاب کرنا تھا مجھے یہ خبر مل چکی تھی کہ لاہور کے مختلف علاقوں میں بی۔ این۔ اے اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے درمیان کئی جگہ تصادم ہوا ہے اور پیپلز پارٹی کے جھنڈے اتحاد کے کارکنوں نے نذر آتش کئے ہیں اور قومی اتحاد نے اسی روز راولپنڈی میں بھی ایک زبردست جلوس نکالا تھا اور عہد کیا تھا کہ اب تحریک مزید شدت سے چلائی جائے گی۔ جب میں اقلیتوں کی ریلی سے راولپنڈی پریس کلب میں خطاب کر رہا تھا تو میرا دل صورت حال کی سنگینی اور لوگوں کی جانب سے اس کے عدم ادراک کے باعث خون کے آنسو رو رہا تھا..... میں نے اپنی تقریر کا اختتام حضرت قیاس شافعی کے ان اشعار پر کیا جو اس سارے ماحول کی حقیقی عکاسی کر رہے تھے جس سے پورا ملک دوچار تھا۔

رشتہ دیوار و در تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے
مت جلا اس کو، یہ گھر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

کھا گئی کل ناگماں جن کو سیاست کی صلیب
ان میں اک نور نظر تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے

کیوں لڑیں آپس میں ہم ایک ایک سنگ میل پر
اس میں نقصان سفر تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے

کاش! اس وقت تذکرہ اشعار کے پس پشت کار فرما احساس درد مندی کا ادراک کیا جاسکتا!
کیم جولائی کی شب ۸ بجے مذاکرات کا دوسرا اور فیصلہ کن دور شروع ہوا۔ ایک ایک شق پر مرحلہ وار پروفیسر غفور نے اپنا نقطہ نظر اور پیرزادہ نے اپنے اعتراضات پیش کئے۔ درمیان میں وزیر اعظم بھی نوٹس لیتے رہے اور مفتی محمود صاحب سے زبردست بحث کتنے پر بحث بھی کرتے رہے۔ کیس مفتی محمود اور ان کے ہمراہی قائل ہو گئے، کیس مسٹر بھٹو کو سرنڈر کرنا پڑا۔ مذاکرات طویل ہوتے چلے جا رہے تھے۔ جن نکات پر اتفاق رائے ہو رہا تھا، انہیں علیحدہ نوٹ کیا جاتا رہا اور جب تک اتفاق رائے نہ ہوا، دونوں جانب سے اس پر دلائل دیئے جاتے رہے۔ بالآخر ساڑھے تیرہ گھنٹے طویل اجلاس صبح ساڑھے چھ بجے ختم ہوا،

جب ۲ جولائی کا سورج طلوع ہوا تو تمام امور پر سمجھوتہ ہو چکا تھا۔ اتحاد کے حتمی مسودے میں تبدیلیاں عمل میں آگئی تھیں۔ مفتی محمود نے یہ کہہ کر اجلاس کو پکینا کہ آج ۲ جولائی کو ہم اپنی۔ این۔ اے کی مرکزی کونسل میں اس سمجھوتے کو رکھیں گے اور اگر کونسل نے منظوری دے دی تو معاہدے پر دستخط ہو جائیں گے۔

اس روز قومی اتحاد کی بانی کمان کا اجلاس تحریک استقلال کے رہنما کرمل (ریٹائرڈ) تصدق حسین کی رہنمائی پر سارا دن جاری رہا۔ مسودے پر گرامر بحث ہوئی اور اصغر خان نے مفتی محمود اور پروفیسر غفور کو آڑے ہاتھوں لیا، محکم سے نزہال پروفیسر غفور اور مفتی محمود نے اصغر خان سے پوچھا کہ ”آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ ہم لوگ کیا کرتے؟“

انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں گرتے گرتے ہوتے جواب دیا۔

”آپ اجلاس سے اٹھ کر چلے آتے۔ کس گدھے نے آپ کو رات بھر جاگ کر مذاکرات کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ تو بھنکی پرانی اور مخصوص چال ہے۔ وہ اس طرح تو جگا جگا کر مارتا ہے۔ یہ اکارڈ سراسر الفاظ کی ہیرا پھیری ہے جسے سمجھنے کی آپ لوگوں کو توفیق ہی نہیں ہو سکتی۔ میں اس سمجھوتے پر لعنت بھیجتا ہوں، اور اگر آپ لوگوں نے اس پر دستخط کئے تو یاد رکھیں کہ میں آپ کے خلاف بھی تحریک چلاؤں گا اور عوام کو بتاؤں گا کہ آپ لوگوں نے شہیدوں کے خون سے غداری کی ہے۔“

اصغر خان کی تلخ و ترش باتوں کو سردار شیر یاز مزاری اور نیکم نسیم ولی خان کے غصے نے اور ممیز کیا، تاہم مولانا نورانی کے سمجھانے بھانے پر اصغر خان قدرے پرسکون ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی نے استفسار کیا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔

اصغر خان نے بھڑک کر کہا..... ”اب آپ لوگ درمیان سے ہٹ جائیں، میں خود تمام معاملات کو ہینڈل کروں گا اور فوج کی طرف سے یہ گارنٹی بھی میں دینے کو تیار ہوں کہ مارشل لاء لگنے کے بعد نوے دن کے اندر اندر فوج الیکشن کرا دے گی۔“

ان کی اس بات پر اجلاس میں سناٹا چھا گیا۔ مفتی محمود نے کافی دیر کی خاموشی کے بعد کہا.....
”آپ جانتے ہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ فوج آئی تو بھٹو کا خاتمہ تو کرے گی، ہی ہاتھ ہمارے بھی کچھ نہ آئے گا۔“

اصغر خان نے ان کی بات کا جواب تحقیر آمیز انداز میں ”ہوں“ کہہ کر دیا اور اجلاس سے نکل گئے۔

پھر پکارنے معاملات کو دوبارہ ٹھیک کرنے اور بی۔ این۔ اے کو باہمی انتشار سے بچانے کے لئے مسودہ قانونی مشیروں کے حوالے کیا اور انہیں کہا کہ

”آپ اس پر اپنے اعتراضات ڈرافٹ کر دیں کل ۳ جولائی کو مذاکراتی ٹیم وہ اعتراضات بھٹو

کے پاس لے جائے گی اور اگر اس نے اتفاق کیا تو سمجھوتہ ہو جائے گا، ورنہ نہیں ہو گا۔“

۳ جولائی کی صبح سردار عبدالقیوم مجھ سے ملنے کے لئے آئے اور بیٹھے ہی کہنے لگے.....

”ہمارے بعض لیڈروں کا آرمی سے رابطہ ہے اور خطرہ ہے کہ آرمی نیک اور نہ کر لے، آپ مسٹر بھٹو سے کہیں کہ سمجھوتے پر دستخط کرنے میں تاخیر نہ کریں، بلکہ ہمت ہو گا کہ آپ مجھے اور مفتی صاحب کو بھٹو صاحب سے مواجہی دیں۔“

میں کابینہ کے اجلاس سے لیٹ ہو رہا تھا لیکن سردار عبدالقیوم کے سسنسی فیز انکشاف کے بعد میں نے اپنے بیڈ روم میں آکر گرین فون پر وزیر اعظم سے براہ راست رابطہ کیا اور انہیں سردار صاحب کے استہاب سے آگاہ کیا۔

وزیر اعظم غالباً ناشتہ کر رہے تھے..... ساری بات سن کر بولے.....

”یار انہیں چھوڑ دو یہ لوگ فقط مجھ سے انڈر پولیٹے کے ہمانے تلاش کر رہے ہیں۔“

یا خدا! میں ان کی بات سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ ان انتہائی نازک لمحات میں بھی انہیں کس شدت سے یہ احساس تھا کہ ان سے ملنا کتنا اہم ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ چونکہ سردار صاحب میرے پاس بیٹھے ہیں اس لئے میں میٹنگ میں ذرا تاخیر سے پہنچوں گا۔ جواب ملا.....

”ٹھیک ہے، تم انہیں بھٹن کر آ جانا“.....

میں نے سردار عبدالقیوم سے معذرت کی اور بتایا کہ اس وقت تو بہت ضروری اجلاس میں جا رہا ہوں واپسی پر ہی انہیں بتا سکوں گا کہ وزیر اعظم سے ان کی ملاقات کب ہو سکتی ہے۔

میں بھیانک سوچوں کے سمندر میں غرق کابینہ کے اجلاس میں شرکت کے لئے پی۔ ایم۔ ہاؤس پہنچا۔ تقریباً پانچ گھنٹے پہلے اجلاس شروع ہو چکا تھا۔ جنوبی میں کینٹ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا، میری نظر جرنل فیصل الحق پر پڑی جو وزیر اعظم کے بالمقابل بیٹھے ہوئے تھے..... مجھے دیکھتے ہی مسٹر بھٹو مسکراتے ہوئے بولے.....

”لو وہ آگئے! اب خود ہی سردار صاحب سے ہونے والی بات بتائیں گے۔“

غالباً یہی موضوع اس وقت زیر بحث تھا..... میں نے انحصار کے ساتھ سردار عبدالقیوم سے ہونے والی گفتگو سے کابینہ کو آگاہ کیا۔ جنرل ضیاء الحق شاید پہلے ہی سردار عبدالقیوم کے خدشات کو مسترد کر چکے تھے۔ وزیر اعظم نے دیگر وزراء کو اس پر اظہار خیال کی دعوت دی تو سب سے پہلے حفیظ جیر زاہد نے اسے پی۔ این۔ اے کا ”نیا شوہ“ قرار دیا اور پھر میں نے دیکھا کہ اکثر وزراء ان کے ہم خیال تھے اور وزیر اعظم بھٹو کی مدح سرائی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

سندھ کے وزیر اعلیٰ غلام مصطفیٰ جتوئی بھی خصوصی دعوت پر کابینہ کے اجلاس میں موجود تھے ان کی خاموشی اس بات کی دلیل تھی کہ وہ سردار عبدالقیوم کی اطلاع کو میری ہی طرح جی برصیقیت محسوس کر رہے ہیں۔

کچھ متفرق باتیں

ذرا کرات کی کہانی، ایک دو اہم موڑ کاٹتے ہوئے اختتام کو پہنچنے والی بے مگر مجھے لگتا ہے، بیچ میں کہیں کہیں کچھ باتیں چھوٹ گئی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے، اختتام یہ تک پہنچنے سے پہلے پہلے انہیں بھی ریکارڈ کر لیا جائے پھر ایک دو سوال ایسے ہیں جو ہر کہ دمہ کی زبان پر ہیں کچھ تھوڑا ان سے بھی تعریض ہو جائے تاکہ قارئین اس تاریخی دستاویز میں کسی طور کوئی کمی محسوس نہ کریں۔

..... ذرا کراتی ٹیوں کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ این۔ اے کی طرف سے اس میں حضرت مولانا مفتی محمود مرحوم، نواب زاہد نصر اللہ خان اور پروفیسر عبدالغفور احمد شریک تھے، یہ تاثر پایا جاتا ہے، جیسے ان کے نام بھی خود بھٹو صاحب نے تجویز کئے تھے، یہ صحیح نہیں، ذرا کراتی ٹیم کا انتخاب تمام وکال حضرت مفتی محمود نے اپنے ساتھیوں کے مشورے سے کیا تھا یہ بات بھی صحیح نہیں کہ وہ اصغر خان کو اپنی ٹیم میں شامل کرنا چاہتے تھے لیکن بھٹو صاحب نہیں مانے۔

ذرا کرات کے سبھی اجلاس کینٹ روم میں ہوئے جو وزیر اعظم کے دفتر کے ساتھ ملحقہ کمرہ تھا اور جہاں کابینہ کے اجلاس ہوا کرتے تھے، ہم میز پر آئے سانسے بیٹھا کرتے تھے، دائیں ہاتھ پی۔ این۔ اے والے، بائیں ہاتھ ہم، مشبقتوں کی ترتیب یوں تھی کہ مفتی محمود صاحب کے دلینے ہاتھ پر نواب زاہد نصر اللہ خان صاحب اور بائیں ہاتھ پروفیسر صاحب اور بھٹو صاحب کے دالینے ہاتھ جیر زاہد اور بائیں طرف میں، اکثر ایسا ہوتا کہ ہم دونوں میٹنگ میں آنے سے پہلے وزیر اعظم کے ہاں پہنچتے وہاں چائے پر آنے والے اجلاس کے بارے میں مشورہ کرتے اور پھر اکٹھے ہی اجلاس میں آتے، ہم دونوں کو جو کچھ کہتا ہوا وہ اجلاس سے پہلے ہی بھٹو صاحب کے گوش گزار کر دیتے، ذرا کرات میں ہم بہت کم بولتے ہماری طرف سے بھٹو صاحب ہی اکثر بات کرتے، اجلاس کے بعد کاروائی پر پھر باہمی تبصرہ ہوتا، بھٹو صاحب ڈسپلن اور رکھ رکھاؤ کے سخت پابند تھے انہیں بہت برالگتا اگر ان کی ٹیم میں ذرا کرات کے دوران پی۔ این۔ اے والوں کے سامنے کوئی اختلاف پیدا ہو جاتا یہ سارا اہتمام اسی مقصد کے لئے تھا۔

پی۔ این۔ اے کی ٹیم میں بھی یقیناً اجلاس میں آنے سے پہلے مشورہ ہوتا ہو گا، مگر وہ پھر بھی نسبتاً اظہار خیال میں آزاد تھے، مفتی محمود صاحب قبلہ اصلاً تدریس مدرسے کے آدمی تھے مگر ان میں مولویانہ تنگ

نظری اور ضد نام کو نہ تھی، کھلے ذہن کے آدمی تھے، جہاں معقول بات سامنے آئی اور وہ مان گئے۔ مفتی صاحب کے ساتھ تو میری پرانی یاد اللہ تھی، ۱۹۶۰ء میں گیارہ دینی جماعتوں کے بننے والے اسلامی محاذ کے وہ صدر تھے اور میں سیکرٹری جنرل، ہم نے ایک ساتھ کئی مرتبہ سفر بھی کیا تھا اور جلسوں میں بھی شرکت کی تھی ان کی خوش گوار عادات اور وسیع الفطرتی سے تو میں بخوبی آگاہ تھا لیکن نواب زادہ نصر اللہ خان کو میں پہلی مرتبہ قریب سے دیکھ رہا تھا ان کو ملا اور مذاکرات میں ان کی اصول پرستی، جمہوریت دوستی اور کارگزاری دیکھی تو بارہا یہ شعر یاد آتا رہا کہ

پیدا کہاں ہیں ایسے پرانگنہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

پروفیسر غفور جماعت اسلامی میں ہمارے پرانے ساتھی تھے گو ہمارے زمانے میں ان کا شمار ابھی اکابر میں نہ ہوا تھا، بے حد محنتی اور سلیقے کے آدمی ہیں، مزاج کے اعتبار سے جماعت کے آدمی نہیں لگتے، اختلاف کے باوجود عزت کرنا بھی جانتے ہیں اور عزت کرنا بھی، متعلقہ کاغذات کا پلندہ ہمیشہ انہی کے ہاتھوں میں ہوتا، اپنی مذاکراتی ٹیم میں لکھنے پڑھنے کا زیادہ تر کام انہیں ہی کرنا پڑتا۔ ہماری ٹیم میں بھٹو صاحب کی ”مذاکراتی مہارت“ تو عالم آفکار تھی، بڑے بڑے بین الاقوامی معرکے انہوں نے سرکئے تھے، مشکل سے مشکل اور جذباتی سے جذباتی مسئلے میں بھی وہ فضا کو تلخ اور بوجھل نہیں رہنے دیتے تھے، کبھی ہلکے ہلکے مزاح کی پھلجھڑی بھی چھوڑ دیتے، وہ ایک ماہر سوداگر کی طرح بارگین (BARGAIN) کرتے۔

ہمارے دوست حفیظ پیرزادہ بے حد ذہین تھے اور محنت کرنے پر آتے تو اس میں بھی کمی نہ کرتے۔ البتہ مزاجاً اور طبعاً حقیقت پسند نہ تھے کبھی جذباتی ہو جاتے تو کبھی ضرورت سے زیادہ پراسید۔ میں اجلاس کے دوران اکثر نوٹ لیتا رہتا، مجھے جو کچھ کہتا ہوتا تھا، میں بھٹو صاحب سے اجلاس سے پہلے یا بعد میں ہی کہہ لیا کرتا۔

اجلاس کے دوران کی ایک بات خاص طور پر یاد رہے گی۔

مفتی صاحب مستقلاً پان خور نہ تھے مگر کبھی کبھی موڈ میں آتے تو پان سے بھی شوق فرمایا کرتے وہ اپنے پان کسی دکان سے خرید کر ساتھ ہی لے آیا کرتے تھے، حضرت مولانا شاہ احمد نورانی کی طرح پان کی ڈبیہ ان کے پاس نہ ہوتی، اب کینٹ روم میں اگال وان کہاں، مفتی محمود صاحب پان خوری کے ایسے ماہر بھی نہ تھے کہ پیک تھوکے کی انہیں ضرورت ہی محسوس نہ ہو، مذاکرات کی نیبل پر پڑے ہوئے الٹس ٹریژس پیک ڈالنے رہتے، سنگ مرمر سے بنے ہوئے یہ خوبصورت الٹس ٹری، لال لال رنگ کی پیک سے بعض اوقات لبالب بھر جاتے اجلاس کے بعد بھٹو صاحب خوش گوار موڈ میں ہوتے تو کہا کرتے یہ ہیں مستقبل

کے تبادُل پر انم فشر جنہیں یہ نہیں معلوم کہ آداب مجلس کیا ہوتے ہیں۔ دو بار وقت بہت زیادہ ہو جانے کی وجہ سے ہم نے کہا تاہی ایک ساتھ کھایا، مفتی محمود صاحب شوگر کے مریض تھے لیکن اس کے باوجود بیٹھا نہیں بے حد مرغوب تھا، بھٹو صاحب نے خاص طور پر سویٹ ڈشز بنوائیں، کھانے کی میز پر خوب خوب نقرے بازی ہوئی، مفتی صاحب کا کستا تھا کہ پروفیسر اور میں بعد میں اپنی بریفنگ کے دوران اخبار نویسوں کو یہ نہ بتائیں کہ ہم نے پرانم فشر کا کھانا کھایا، لوگ کہیں گے ہم مر رہے ہیں اور ہمارے لیڈر ضیافتیں ازار ہے ہیں۔“

شروع کے دو تین اجلاسوں میں گرفتار شدگان اور نظربندوں کی رہائی پر ملی۔ اس۔ اسے کے لیڈروں نے بہت زیادہ زور دیا، مفتی صاحب خاص طور پر اپنے حلقہ انتخاب ڈیرہ اسماعیل خان کے بعض افراد کا ذکر کرتے، میری ڈائری میں شروع کی اس طرح کی ایک میٹنگ میں ہونے والی بات چیت من و عن یوں ہے۔

مفتی صاحب..... ذی آئی خان میں شیخ عزیز الرحمن گلشیر، عمر عظیم اور مولانا عبدالسلام کو ابھی تک رہا نہیں کیا گیا۔

بھٹو..... مفتی صاحب! بنیادی بات پر آئیں ورنہ خواہ مخواہ تاخیر ہوگی۔

مفتی صاحب..... پھر میں پوائنٹ تو نے الیکشن اور اس کے کرانے کے انتظامات اور دوسرے متعلقہ امور ہیں۔

بھٹو..... کیا سینوں پر مصالحت نہیں ہو سکتی؟

مفتی صاحب..... ہم نے تحریک عوام کو حق دلانے کے لئے چلائی ہے، سینوں کے لئے نہیں۔

بھٹو..... تو بات ختم، پیر صاحب نے کہا تھا ”ری پولنگ کو رول آؤٹ نہ کرو“ جیسا کہ پروفیسر غفور نے بھی کہا تھا۔

پروفیسر غفور..... ہاں! اور دوسرے بھی اس سے متفق تھے۔

نواب زادہ..... ری پولنگ؟

بھٹو..... جیسے سات تاریخ پھر آ رہی ہے، سب پر مقابلہ ہو گا۔

پروفیسر غفور..... پھر ٹھیک ہے۔

بھٹو..... پھر ’بل‘ کا نشان میں واپس لے لوں گا۔

مفتی صاحب..... یہ بعد کی بات ہے۔

نواب زادہ..... کیا کمیٹین نہیں ہوگی؟

بھٹو..... ہاں۔

نواب زادہ..... بلوچستان میں کیا ہو گا جہاں ہم نے الیکشن نہیں لڑا۔

کو ہٹانے والے تھے انہوں نے وینس کے سیکرٹری جنرل غلام اہلق خان (حالیہ چیئرمین سینٹ) سے بات کی تو انہوں نے آگے جنرل ضیاء الحق کو بتا دیا اور الٹ ہو گئے اور انہوں نے بھٹو صاحب کے وار سے پہلے خود ان پر وار کر دیا۔ اسی صلے میں غلام اہلق خان کو بارشل لاء کے دور میں یہ اہمیت ملی کہ وہ سینئر منسٹر بن گئے اور اب تک جنرل ضیاء الحق کے نفس ناطقہ چلے آتے ہیں۔

جہاں تک جنرل ضیاء الحق کو ہٹانے کا تعلق ہے، بھٹو صاحب یقیناً یہ فیصلہ کر چکے تھے، اس کا اشارہ وہ جنرل عبداللہ ملک کو بھی دے چکے تھے بلکہ بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جنرل عبداللہ ملک ہی کو جنرل ضیاء الحق کی جگہ مقرر کرنے والے تھے اس کے لئے وہ مناسب موقع کے منتظر تھے، سیاسی تقفیر ہو جاتا اور ملک میں امن و امان قائم ہو جاتا اقتدار پر ان کی کامل گرفت ہو جاتی تو تب وہ یہ اقدام کرتے مگر ابھی تو وہ مرحلہ ہی نہیں آیا تھا کہ اس کا ذکر وہ کسی سے کرتے، رازداری اور دل کی بات دل میں رکھنے کا انہیں حیرت انگیز ملکہ تھا اور پھر اگر وہ یہ بات کرتے بھی تو نکاحان سے تو کر سکتے تھے غلام اہلق خان سے تو کسی صورت وہ ایسی راز کی بات نہ کرتے۔

غلام اسحاق خان سے بھٹو صاحب کی کبھی نہیں بنی، مجھے وہ اجلاس یاد ہے جس میں دیر کے لوگوں کے خلاف آرمی ایکشن پر غور و خوض ہوا، صوبوں کے گورنر بھی تھے اور کابینہ کے اراکین بھی، جنرل فضل حق علاقے کے کور کمانڈر تھے، اس وقت بھی ڈبنگ آدمی تھے انہوں نے بریفنگ دی، سب نے باری باری اظہار خیال کیا، غلام اسحاق خان کی باری آئی تو انہوں نے کہا میں اس سے اتفاق نہیں کرتا، آرمی ایکشن غلط ہے، یہ صورت حال سول حکام کی مس بینڈنگ کا نتیجہ ہے، جنگلات کی کمانی پر ہی دیر کے عوام کی زندگی کا انحصار تھا آپ نے ان سے یہ حقوق چھین لئے وہ یہ بتانے کے لئے لانگ مارچ کرنا چاہتے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کشمیر میں قربانیاں دی تھیں اب یہ پاکستان سے کس طرح ایسے منحرف ہو سکتے ہیں کہ اس کے خلاف بغاوت کر دیں۔“

بھٹو صاحب کو حکومت کے ایک سیکرٹری کی طرف سے کھلم کھلا اس طرح کا اختلاف اچھا نہ لگا انہوں نے کہا۔

”جو لوگ حکومت کی پالیسی سے اتفاق نہیں کرتے وہ حکومت میں نہ رہیں۔“

اگلے دن یہ خبر گرم تھی کہ غلام اسحاق خان استعفیٰ دے رہے ہیں پرائم منسٹر نے انہیں بلا یا اور کہا۔

”میں آپ کی قدر کرتا ہوں مگر میں جرنیلوں کی موجودگی میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ آپ کہیں یہ حکومت اور فوج کی غلطی ہے آپ استعفیٰ نہ دیں، کل پریڈ ہے آپ میرے ساتھ بجلی کا پڑ میں کا کول چلیں تاکہ کل کا تاثر ختم ہو جائے۔“

اسی طرح کا ایک واقعہ ۱۹۷۷ء کے الیکشن کے بعد ہوا، بھٹو صاحب نے آرڈر فور سز کے

بھٹو..... اس پر فوج کے کچھ خیالات ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہم فوراً وہاں سے ہٹ نہیں سکتے، ہمیں وہاں سے ہٹنے میں چھ ماہ لگیں گے۔

پروفیسر غفور..... اگر وہ آپریشن بند کر دیں تو کافی ہے۔

بھٹو..... وہ کہتے ہیں، پہل ادھر سے ہوئی ہے۔“

مفتی صاحب..... انڈر سٹینڈنگ ہوگی تو پہل کیوں ہوگی؟

پروفیسر غفور..... آپ کا بیان کافی ہوگا، اب چواییشن نارمل ہے، فوج سے کنٹرول لے لیا گیا ہے۔

بھٹو..... مگر وہ کہتے ہیں نارمل ہونے میں چھ ماہ لگیں گے، خیر، ”کوئلنگ آف پریڈ“ تو ہمیں چاہئے ہو گا، ہم اپنی حکومت کی مدت میں اگست ۱۹۷۸ء تک ایک سال بڑھا سکتے تھے۔

پہر زاوہ..... اکتوبر ۱۹۷۸ء تک۔

پروفیسر غفور..... الیکشن کمیشن کو پورے اختیارات ملنے چاہئیں۔

بھٹو..... وہ کوئی پرائلیم نہیں۔

اجلاس کے پہلے روز ہی بھٹو صاحب نے پی۔ این۔ اے کے لیڈروں کو ان سٹیوں کی پیش کش کی جس پر ان کے نزدیک دھاندلی ہوئی تھی۔ ہم ان نشستوں پر کامیاب ہونے والے امیدواروں سے استغنے لے لیتے ہیں اور رہی پٹنگ اپنے آدمی کھڑے نہیں کرتے مگر پی۔ این۔ اے کی ٹیم نے اس آفر کو قبول نہیں کیا۔

قومی حکومت بنانے کی تجویز بھی زیر غور آئی، بھٹو صاحب ہی اس کے مجوز تھے، ان کا کہنا تھا کہ وہ کابینہ میں پی۔ این۔ اے کے چار وزیر لینے کو تیار ہیں مگر ان کے محکموں کا انتخاب وہ خود کریں گے، پی۔ این۔ اے کی ٹیم آدھے وزیر چاہتی تھی مگر بھٹو صاحب چار کی تعداد سے آگے نہیں بڑھ رہے تھے، اگلے روز میں نے دوران مذاکرات پانچ وزارتوں کی پیش کش کر دی میرا خیال تھا کہ شاید پی۔ این۔ اے والے مان جائیں گے اور مذاکرات کے آغاز میں قومی یک جہتی کی کوئی صورت نکل آئے، ویسے بھی میں جانتا تھا کہ بھٹو صاحب کی کابینہ میں آکر پی۔ این۔ اے کے وزیر بھٹو صاحب ہی کا ساتھ دیں گے، پی۔ این۔ اے عوام میں اپنی ساکھ کھو بیٹھے گی لوگ کہیں گے کہاں تو وزیر اعظم سے استغنے کے مطالبے کئے جا رہے تھے اور کہاں اب اس کو وزیر اعظم بنا کر پی۔ این۔ اے حکومت میں شریک ہو گئی ہے، میں نے پانچ وزارتوں کی بات کی تو بھٹو صاحب فضا ہو گئے تاہم ان کی ٹیم کے ایک رکن نے یہ پیش کش کی تھی اب وہ اس سے انکار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مگر افسوس کہ پی۔ این۔ اے وزارتوں کی نصف تعداد لینے پر بضد تھی، پانچ وزارتیں بھی اسے مطمئن نہ کر سکیں۔

ایک سوال عوامی حلقوں میں یہ بھی زیر بحث رہتا ہے کہ کیا یہ صحیح ہے کہ بھٹو صاحب، جنرل ضیاء الحق

سربراہوں سے اپنے حق میں ایک مشترکہ بیان جاری کرا یا جس میں انہوں نے اعلان کیا تھا کہ ہم حکومت کے ساتھ ہیں نیز یہ بھی کہا تھا کہ الیکشن فیئر ہوئے ہیں، جنرل ضیا یہ بیان جاری کرنے کے بعد غلام اسحاق خان سے کسی کام کے سلسلے میں ملے تو خان صاحب نے ان سے کہا۔

”آپ سے یہ بیان جاری کرنے کو کس نے کہا تھا؟“

”اس میں کیا حرج ہے؟“ جنرل ضیا بولے۔

”یہ تو صحیح ہے کہ آپ حکومت کے ساتھ ہیں“ غلام اسحاق خان نے کہا۔

”مگر آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ الیکشن فیئر ہوئے ہیں۔ یہ سرٹیفکیٹ آپ نے کس تحقیقات کے

نتیجے میں جاری کیا؟“

اب معلوم نہیں جہاں خان صاحب بات کر رہے تھے وہاں ایسے آلات لگے ہوئے تھے یا کسی اور ذریعے سے، مہنہ صاحب کو اس کی اطلاع مل گئی، وہ خان صاحب کی اس صاف بیانی پر بہت برہم ہوئے۔

جس سیکرٹری سے مہنہ صاحب کے اس طرح کے تعلقات ہوں اس کو اعتماد میں لے کر وہ جنرل

ضیا کو ہٹانے کا راز کیسے بنا سکتے تھے؟

ایک سوال یہ بھی پوچھا جاتا ہے کہ مہنہ صاحب مذاکرات کے نتیجے میں ملے پا جانے والے سمجھوتے کو بیچ ہی میں چھوڑ کر اس پر دستخط کئے بغیر بیرون ملک کیسے روانہ ہو گئے؟ اس سفر کے مختلف پہلوؤں پر پچھلے ابواب میں کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے، صرف اس نکتے کا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں انہوں نے یہ بتایا تھا کہ چونکہ اب نئے انتخابات ناگزیر ہیں، پی۔ این۔ اے سے ان کی تاریخ بھی ملے پائی ہے اس لئے اب میں بیرون ملک بعض ان سربراہان مملکت سے جو میرے ذاتی دوست بھی ہیں، پیپلز پارٹی کے لئے فنڈز حاصل کرنا چاہتا ہوں، اندرون ملک تو اب سرمایہ دار اور صنعت کار ہمیں کچھ دینے سے رہے۔

بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ کرٹل قذافی سے یہ بات کرنے گئے تھے کہ میں روس کو گواہ اور کی بندرگاہ دینے کو تیار ہوں، میرے علم میں اس طرح کی کوئی بات نہیں آئی، جو لوگ سفر میں ان کے ہمراہ تھے ان میں آغا شہابی کا مستعبر نام بھی شامل ہے، میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے بھی اس طرح کی کسی موو (MOVE) سے لاعلمی کا اظہار کیا، البتہ یہ ضرور ہے کہ قذافی سے مہنہ صاحب کی ان ملاقاتوں میں وفد کا کوئی رکن شریک نہ تھا، وہ دونوں تحلیلہ ہی میں مذاکرات کرتے رہے۔

اسی کتاب میں میں نے ایڈیٹار شل (ریٹائرڈ) محمد اصغر خان کے اس خط کا بھی ذکر کیا ہے جو انہوں نے افواج پاکستان کے آفیسروں کے نام لکھا تھا۔ اس خط کا مکمل متن اردو میں دیا جا رہا ہے۔

۲۵ اپریل ۱۹۷۷ء

میرا یہ پیغام ڈیفنس سروسز آف پاکستان کے چیف آف سٹاف اور افسروں کے نام ہے۔ آپ کا یہ فرض ہے کہ پاکستان کی علاقائی سالمیت کا دفاع کریں اور خود پر متعین اعلیٰ افسران کے قانونی احکامات کی نجات دہی کریں۔ قانونی اور غیر قانونی احکامات میں تمیز کرنا ہر افسر کا فرض ہے۔ آپ میں سے ہر ایک کو خود سے یہ پوچھنا چاہئے کہ فوج ان دنوں جن سرگرمیوں میں مصروف ہے، کیا وہ قانونی ہے، اگر آپ کا ضمیر یہ جواب دے کہ یہ سرگرمیاں قانونی نہیں اور پھر بھی انہیں جاری رکھیں تو پھر ”آپ اخلاقی طور پر دیوالیہ اور اپنے ملک و قوم کے خلاف سنگین جرائم کے مرتکب ثابت ہوں گے۔“

اب تک آپ یہ جان چکے ہوں گے کہ مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن ایک سازش تھی جس میں موجودہ وزیراعظم نے شاطرنے کردار ادا کیا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ کن حالات میں بلوچستان میں فوجی ایکشن کیا گیا اور یہ ایکشن کتنا غیر ضروری تھا۔ آپ شاید گذشتہ سال دیر صوبہ سرحد میں گئے تھے فوجی ایکشن سے بھی آگاہ ہوں گے۔ اگر آپ کو قومی مفاد سے کوئی دلچسپی ہے تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ موجودہ ایکشن مہم میں عوام نے موجودہ حکومت کو زبردست طریقے سے مسترد اور نامنظور کر دیا ہے۔ عوام کی طرف سے موجودہ حکومت مسترد کر دینے کے باوجود آپ موجودہ ایکشن کے نتائج پر حیران ہوئے ہوں گے کہ پاکستان قومی اتحاد جسے عوام کی زبردست تائید حاصل ہے صوبہ پنجاب ایک سوسائٹسٹوں میں سے صرف آٹھ نشستیں جیت سکا۔ آپ یقیناً یہ بھی جانتے ہوں گے کہ متعدد لوگوں کو اپنے کانڈنات نامزدگی داخل کرنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔ کیا آپ اسے ایک اتفاقی امر کہیں گے کہ وزیراعظم اور چاروں صوبوں کے وزراء اعلیٰ کے خلاف کسی شخص نے کانڈنات نامزدگی داخل ہی نہیں کئے، جن لوگوں نے کانڈنات داخل کرنے کی کوشش کی انہیں چند راتیں پولیس کی حراست میں رکھنا پڑا، جن میں سے ایک کا ابھی تک سراغ نہیں مل سکا۔

”آپ میں سے جن لوگوں کی ذہنی ۷ مارچ کے ایکشن کے سلسلے میں متعین کی گئی تھی وہ جانتے ہوں گے کہ دھاندلی کتنے وسیع پیمانے پر ہوئی ہے۔“ قومی اتحاد کے امیدواروں کے لاکھوں بیلٹ پیپروں کو بیلٹ بکسوں میں سے نکال لیا گیا، ۷ مارچ کے انتخابات کے بعد پاکستان کی گلیوں اور کھیتوں میں پائے گئے صوبائی انتخابات کے موقع پر ۱۰ مارچ کو جب قومی اتحاد نے صوبائی انتخابات کے بائیکاٹ کی اپیل کی تھی تو آپ نے ویراں اور سحرزدہ پولنگ اسٹیشن دیکھے ہوں گے، اس کے باوجود حکومت کے ذرائع نے اعلان

کیا کہ ووٹ بھاری تعداد میں ڈالے گئے ہیں اور یہ ڈالے گئے ووٹ کل تعداد کا ساٹھ فیصد سے زائد تھے اور پھر آپ نے اس تحریک کا بھروسہ کیا ہو گا جو بھمنو کے استعفیٰ اور عام انتخابات کے دوبارہ انعقاد کے لئے چلائی گئی تھی۔

ہاتھوں میں بچے اٹھائے۔ روروں عورتوں کا جوس گلیوں میں نکل آنا ایسا منظر تھا جسے کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وتر درتیں تھیں جن کے متعلق بھنو کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے اسے ووٹ دیئے تھے۔ اس تحریک نے چند دنوں میں یہ بات ثابت کر دی کہ عوام نے بھنو اور اس کی حکومت کو مسترد کر دیا ہے۔ ہمارے ہزاروں نوجوانوں کی موت، ماؤں اور بہنوں پر تشدد کے واقعات نے آپ کے سر شرم اور غم سے جھکا دیئے ہوں گے۔ کیا آپ نے سوچا کہ لوگوں نے خود کو اتنی مصیبت میں کیوں ڈالا۔ نائیں گور میں بچے لئے گولیوں کا سامنا کرنے کیوں آئیں، والدین نے اپنے بچوں کو پولیس کی گولیوں اور لڑکیوں کا سامنا کرنے کی اجازت کیوں دی، یقیناً اس لئے کہ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے ساتھ دھوکہ اور فراڈ کیا گیا ہے۔ ان کے حکمرانوں نے انہیں قبول کرنے یا مسترد کرنے کا بیاداری حق دینے سے انکار کر دیا ہے۔ جب ہم نے عوام کو سمجھا یا تو وہ سمجھ گئے کہ آپ نے مسلح افواج کے افسر ہونے کی حیثیت سے جس آئین کا دفاع کرنے کا حلف اٹھایا ہے اس آئین کی خلاف ورزی کی گئی، اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کے آرٹیکل ۲۱۸ (۳) کے مطابق کسی انتخابات کے سلسلے میں تشکیل کردہ الیکشن کمیشن کا فرض ہے کہ وہ الیکشن کے سلسلے میں ایسے انتخابات کرے جن کے نتیجے میں ایماندارانہ منصفانہ، آزادانہ اور قانون کے مطابق انتخابات ممکن ہو سکیں، جبکہ وہ اس سلسلے میں بد عنوانیوں کو ختم کرے۔

میرے ”دوستو یہ منصفانہ اور آزادانہ انتخابات نہیں تھے“ بھمنو نے آئین کی خلاف ورزی کی ہے اور وہ عوام کے خلاف سنگین جرائم کا مرتکب ہوا ہے۔ آپ پر یہ فرض نہیں کہ آپ ایک غیر قانونی حکومت کی حفاظت کریں اور نہ ہی آپ کو ملک کے عوام کو قتل کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ تاکہ بھنو اپنی حکومت کچھ عرصہ اور برقرار رکھ سکے، کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ دیجئے کہ ”پاکستان کی مسلح افواج ایسی دیوالیہ پولیس فورس ہے“ جن کا کام صرف غیر مسلح شہریوں کو ہلاک کرنا ہے، آپ اس معصوم بچے کو گولی مار کر ہلاک کر دیئے جانے کی کس طرح وضاحت کر سکتے ہیں، جس نے لاہور میں فوج کو ۷ کا نشان دکھایا تھا۔ ہمیں اپنے نوجوانوں میں بزدلی سے زیادہ خود اعتمادی پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اور یہ محسوس حادثہ پاک فوج کے نام ایک ایسا دھبہ ہے جس کو صاف کرنا مستحکم ہو گا۔

اسی طرح کراچی میں غیر مسلح افراد پر فوج کی فائرنگ بھی ناقابل معافی ہے۔ ”کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ اپنی تاریخ کے تیس بدترین سالوں کے دوران پاکستان بھر کے عوام نے اپنی افواج کیلئے محبت اور خلوص کا جذبہ ظاہر کیا ہے، جب آپ نے مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالے تو عوام خون کے آنسو روئے۔ انہوں نے ہمیشہ آپ کی عزت کی دعائیں مانگی“ انہوں نے خود کو بھوکا رکھا اور اپنے بچوں کو بھوکا مارا کہ آپ کو

پیٹ بھر کر کھانے والے اور آپ کے جہز اور اعلیٰ آفسر ایسی زندگی گزار سکیں، جو برطانوی اور امریکی جرنیلوں کو نصیب نہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے۔ محبت، دم توڑ چکی ہے، اب خدارا اسے نفرت میں مت بدلنے دیجئے۔ اگر ایسا ہو گیا تو یہ ہماری تاریخ کا ایسا سناٹا ہو گا، جس کا تدارک ہم اپنی زندگی میں نہیں کر سکیں گے۔

ایک وقت مٹھن کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ آپ اپنے فرائض کو انجام دیں۔ موجودہ حالات میں فرائض کا مطلب غیر قانونی احکامات کی اندھا دھند بجا آوری نہیں ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ قوم کا ہر شخص خود سے یہ پوچھتے کہ جو صحیح کہہ رہا ہے یا غلط، آپ کے لئے یہ وقت آ گیا ہے، اس اپیل کا ایمانداری سے جواب دیں اور پاکستان کو بچائیں، خدا آپ کی حفاظت کرے۔

محمد اصغر خان

بیسواں باب

بھٹو مودودی ملاقات

پہلیز پارتی کی عوامی تحریک بالخصوص انتخابات کے دوران بھٹو صاحب کی جماعت اسلامی سے شخصی رہی، یوں تو مذہبی مجاز پر "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح کو کفر ٹھہرانے والے علماء کی کمی نہ تھی۔ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم ان کے سرخیل تھے۔ کفر کے مشہور فتوے پر علانے کرام کی دستخطی مہم بھی انہی کی کوششوں کی مرہون منت تھی مگر بھٹو صاحب اس میدان میں اصل حریف جماعت ہی کو سمجھتے تھے۔ اس لئے جہاں انتخابات میں ان کی تنقید کا اصل ہدف جماعت اور مولانا مودودی کی مخالفت کا زور کم کیا جائے۔ شروع شروع میں ان کی سوچ یہ تھی کہ اسے خلاف قانون قرار دے دیا جائے۔ اس کے لئے قدر تا مجھ سے مشورہ کرنا ضروری تھا، میں نے اس کی مخالفت کی۔ انہیں بتایا کہ جماعت ایک نظریاتی تنظیم ہے اور نظریے کو کسی بھی طاقت سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ جماعت کو یہ بھی مکہ حاصل ہے کہ وہ کسی بھی دوسرے نام سے دوبارہ کام شروع کر سکتی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ حکومت کی ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بدنامی تو ہو جائے گی مگر وہ اس اقدام سے فائدہ کچھ بھی حاصل نہیں کر سکے گی۔ بات ان کی سمجھ میں آگئی اور بعد کے تمام مراحل میں انہوں نے پھر ان خطوط پر سوچنا چھوڑ دیا۔ البتہ اب ان کی خواہش یہ تھی کہ جماعت کو کیونرزم اور سوشلزم کا خطرہ دکھا کر کسی نہ کسی طرح پیپلز پارٹی سے درپردہ تعاون یا کم سے کم اس کی مخالفت ترک کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس مقصد کیلئے بعض دوسری تدابیر اختیار کرنے کے علاوہ انہوں نے ایک شریف اور دھیسے مزاج کے بیورد گریٹ افضل سعید خان کی خدمت حاصل کیں جو مولانا سید ابوالخلی مودودی مرحوم کے قریبی عزیز تھے اور گھر میں ملاقات کی وجہ سے ان سے ہر وقت رابطہ کرنے کی پوزیشن میں تھے۔

اپنے زمانہ حکومت میں مولانا مرحوم سے بھٹو صاحب نے کسی کسی موقع پر کیسے رابطہ قائم کیا، ان دونوں کی باہمی ملاقات کیسی رہی، اس وقت یہ تفصیل تو ہمارے موضوع سے خارج ہے البتہ انتخابات کے بعد پیپلز پارٹی کے خلاف ہونے والے ایجنڈیشن کے دوران حضرت مولانا سے بھٹو صاحب کی ملاقات کے تذکرے کے بغیر یہ کتاب نامکمل رہے گی، میں نے اس کی تفصیلات کی تصدیق حضرت مولانا کے ذہن صاحبزادے عزیز بی سید محمد فاروق مودودی سے بھی کر لی ہے جو اس واقعہ کے عین شاہد ہیں۔

تحریک کے دنوں میں افضل سعید خان مولانا مودودی سے ملتے رہے اور انہیں اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ وہ بھٹو صاحب سے ملاقات کر لیں لیکن حالات اتنے خراب تھے اور عوام میں بدگمانیاں پھیلنے کا اتنا قوی خدشہ تھا کہ مولانا اس پر آمادہ نہیں ہوئے، بعد میں رازر شید نے اپنے دیرینہ تعلقات کو بروئے کار لاتے ہوئے اس وقت کے امیر جماعت اسلامی پنجاب پیر محمد اشرف کو رابطے کا ذریعہ بنایا، پیر صاحب ایک مجلس آراء شخصیت ہیں اور پھر انہیں اس زمانے میں مولانا مودودی کی مزاج میں بھی کافی دخل تھو وہ ایک دن راز صاحب کے ہمراہ مولانا کی خدمت میں پہنچے اور انہیں منکر بنی چھوڑا۔ ۱۴ مئی کو بے وقت ملاقات کا وقت طے ہو گیا۔

۱۴ مئی کا دن بنگاموں کا دن تھا، لاہور کی پہلی بندنگ سے مسلسل فائزنگ ہو رہی تھی۔ نجوم نے اسے آگ لگا دی۔ شعلے آسمان سے پاتیل کرنے لگے، لاہور سے صوبائی اسمبلی کے رکن اور پی پی پی کے ایک دستگاہ رہنما طارق وحیدرت کی قیادت میں ایک دست بردا جلوس نکالا گیا جس سے فضا میں کھچاؤ اور بڑھ گیا، مرنجیاں مرنجی چوہتری عید محمد کے رتن سینما و قومی اتحاد والوں نے آگ لگا دی، اسی فضا میں بھٹو صاحب لاہور پہنچے تاکہ وہ مولانا مودودی کو بیچ میں ڈال کر اپوزیشن کو تحریک بند کرنے پر آمادہ کر سکیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے لاہور آنے سے پہلے انہوں نے کابینہ کے کسی ذریعے سے اس سلسلے میں مشورہ نہیں کیا تھا، اگر ہم سے پوچھتے تو ہم انہیں بتاتے کہ ان کی یہ کوشش کتنی بعد از وقت ہے اتنی کہ اب اگر خود پلہ این اے بھی تحریک کو ختم کرنا چاہے تو اسے اس میں کامیابی نہیں ہوگی۔

شام کے چوبیس بجے بریگیڈ نریشیر سفید کپڑوں میں ۵۔ اسے ذیلدار پارک اچھروا لاہور پہنچے جہاں مولانا مودودی بڑی سادگی لیکن بڑی انفاست سے قیام پذیر تھے مولانا کے صاحبزادے سید محمد فاروق مودودی مولانا کے اسے ڈی سی کادر چرکتے تھے، وہ ان سے ملے اور انہیں بتایا کہ بھٹو صاحب ٹھیک نو بجے سیان پہنچ جائیں گے، ساڑھے آٹھ بجے تو پنجاب پولیس کے آئی سی اور ڈی آئی سی آگئے، وہ اس کمرے کا معائنہ کرنا چاہتے تھے جہاں یہ ملاقات ہونے والی تھی ان کا مقصد سکيورٹی کے نقطہ نظر سے تمام انتظامات کا جائزہ لینا تھا۔ فاروق نے یہ کہہ کر ان کی خواہش پوری کرنے سے انکار کر دیا کہ سکيورٹی ہماری ذمہ داری ہے۔ آپ کو "داخل در مشغولات" دینے کی ضرورت نہیں، اس منٹ بعد دوبارہ یہ حضرات آگئے اب کے دو یہ اطلاع دینے آئے تھے کہ بھٹو صاحب سے پہلے راز صاحب نہیں گئے اور راز صاحب انہیں بٹھا دیا جائے، ٹویٹے میں میں منٹ تھے کہ پیر اشرف کے جلوس میں راز صاحب بھی تشریف لے آئے، مولانا کے کمرے سے باہر کے برآمدے میں انہیں بٹھا دیا گیا، فاروق مودودی گرم اور نوجوان خون رکھتے ہیں یوں بھی اس زمانے میں وہ پلہ این اے کے بردست موید تھے، پیر صاحب سے الٹھ پڑے، پیر صاحب کو پھٹتے ہی بنی،

ٹھیک نو بجے کہ رو منٹ پر بھٹو صاحب اپنے ملٹری سیکرٹری جنرل امتیاز کے ہمراہ مولانا کی قیام گاہ پر پہنچے، ایک ڈانٹ بھی ان کے ہمراہ تھا، فاروق نے آگے بڑھ کر استقبال کیا، راز صاحب نے تعارف کرایا تو

بھٹو صاحب نے پوچھا ”کیا تعلیم حاصل کر رہے ہو؟“
”نہیں“ فاروق نے جواب دیا۔

”تو کیا کوئی کاروبار کرتے ہو؟“ بھٹو صاحب نے دوبارہ پوچھا

”جی نہ میں پڑھتا ہوں نہ کاروبار کرتا ہوں، پوری قوم آج کل جلسہ جلوس کر رہی ہے میں بھی یہی کام کرتا ہوں“ فاروق نے کھردرے انداز میں جواب دیا ”پوری قوم آپ کا استغنی مانگ رہی ہے میں بھی یہی چاہتا ہوں، آپ استغنی کب دے رہے ہیں؟“

بھٹو صاحب کا اس شاندار استقبال پر بخون تو کھول اٹھا ہوا گمراہ موقع محض دیکھ کر غصہ پنی گئے، ابھی وہ کچھ کہنے کے لئے سوچ ہی رہے ہوں گے کہ فاروق نے نہیے پر دہلا مارا ”خیر، آپ مجھ سے تو کیا بات کریں گے آپ تو ایک بہت ہی شریف آدمی سے بات کرنے آئے ہیں۔ چلے میں آپ کو ان کے پاس لئے جاتا ہوں“

مولانا ان دونوں بیار تھے، انہیں بخار بھی آ رہا تھا اور جوزوں میں بھی درد تھا، بھٹو صاحب ان کے ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھے تو پانچ منٹ کے بعد وہ بھی تشریف لے آئے، بھٹو صاحب نے کھڑے ہو کر بڑے ادب سے ان کے ساتھ مصافحہ کیا اور ان کی خیریت دریافت کی، رسمیات کے تبادلے کے بعد دونوں اصحاب بیٹھ گئے، فاروق ساتھ والے کمرے میں چلے گئے، اب یہ دونوں اکیسے تھے مگر ان کی بات چیت ساتھ کے کمرے میں سنا ہی دے رہی تھی۔ ملازم سیون اپ لیا تو بھٹو صاحب نے اسے چکھا اور گلاس رکھ دیا، بیس منٹ بعد چائے آئی اس کے ساتھ دوسرے لوازمات بھی تھے لیکن بھٹو صاحب باتیں ہی کرتے رہے۔ انہوں نے کھانے پینے سے احتراز کیا، اب فاروق ان کی آواز سن رہا تھا۔

”میں سفید کانڈر دستخط کر کے دینے کو تیار ہوں، آپ اس پر جو لکھنا چاہیں میرے لئے قابل قبول ہوگا“ بھٹو صاحب کہہ رہے تھے۔ ”میں نے آج سے دو ماہ پہلے کچھ نکات آپ کے سامنے رکھے تھے“ مولانا نے فرمایا ”وہ وقت تو آگرا آپ اس وقت انہیں تسلیم کر لیتے تو آپ کا اقتدار بچ سکتا تھا، گمراہ وقت آپ نے ضائع کر دیا۔ آج جیتنے پارتی کے کارکنوں کو سڑکوں پر لاکر عوام سے ان کا سخ تصادم کرایا گیا ہے، قوم خانہ جنگی کی صورت حال سے دوچار ہے، اب صرف ایک ہی صورت ہے کہ آپ فوراً استغنی دے دیں ورنہ آپ کی زندگی خطرے میں ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ نے استغنی دے دیا تو میں آپ کی جان بچانے کی کوشش کروں گا“

بھٹو صاحب نے یہ سنا تو انہوں نے ایک طویل تقریر کی، بین الاقوامی صورتحال، امریکہ، کارول، سرحدوں کی نزاکت، یہ سارے موضوعات ان کی تقریر میں شامل تھے۔ پچھن منٹ کی ملاقات میں ان کی یہ تقریر تقریباً پینتالیس منٹ پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس دوران مولانا مودودی دس منٹ بولے ہوں گے ان کے آخری جملے بھی وہی تھے جو انہوں نے شروع میں کہے، بھٹو صاحب نے اس کے جواب میں صرف اتنا کہا

”مولانا! میں آپ کی عزت کرتا ہوں، آپ کی ہر بات مان سکتا ہوں مگر استغنی نہیں دے سکتا“
ملاقات ختم ہوئی تو مولانا مودودی بھی بھٹو صاحب کے ساتھ باہر نکلے انہیں کار میں بٹھایا اور اندر تشریف لے گئے، باہر موز پر ایک ہجوم جمع ہو گیا تھا بھٹو صاحب کی آمد کتنی ہی خفیہ کیوں نہ رکھی جاتی یہ اتنا معمولی واقعہ تھا کہ لوگوں کو اس کی خبر نہ ہوتی مولانا نے پہلے ہی فاروق کے ذریعے باہر جمع ہونے والے لوگوں کو کہہ دیا تھا کہ بھٹو صاحب ان کے ممان ہیں ان کے خلاف کوئی نعرہ نہ لگنے پائے، اسلامی جمعیت طلبہ کے جوشیلے کارکنوں سے خطرہ تھا کہ کہیں وہ اس موقع پر کوئی بد مزگی نہ پیدا کر دیں، ان کا مرکزی دفتر اسی گلی میں کو بھی گھر ایک میں واقع تھا، جماعت کے ایک پرانے ہمدوق عمیدار عبدالوہید خان صاحب کے ذریعے ان کی ذیوقی لگا دی گئی کہ وہ مجمع کو بنائیں، گلی میں کوئی آدمی نہ رہے، بھٹو صاحب کے کانڈر وہ بھی سفید کپڑوں میں گلی میں گھوم پھر رہے تھے لیکن مولانا مودودی کی شرافت سے بعید تھا کہ وہ گھر آئے ہوئے ایک معزز مسلمان کی عزت و تکریم میں کسی طرح کا بھی کوئی فرق آنے دیں۔ سو انہوں نے یہ فرق نہیں آنے دیا۔

ادھر یہ ملاقات جاری تھی ادھر منٹوں سیکنڈوں میں ہوا کے دوش پر یہ خبر لاہور کے گلی کوچوں میں پھیل گئی، پندرہویں منٹ کے بعد چالیس کے قریب اخباری نمائندے مولانا کی قیام گاہ پر پہنچ چکے تھے، مولانا نے ایک مختصر سا تحریری بیان پڑھانیا ان کے صاحبزادے کے ہاتھ کی تحریر تھی جس میں صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ مولانا مودودی نے بھٹو صاحب کو استغنی دینے کا مشورہ دیا ہے، سوالات کی ایک بوجھاڑ تھی لیکن ان سب سوالوں کے جواب میں مولانا نے صرف اتنا کہا۔

”میں معذرت چاہتا ہوں، میری صحت اس قابل نہیں ہے کہ آپ کے سوالوں کے جواب دے سکوں“

ایسواں باب

اور..... لائن کٹ گئی

۳ جولائی اتوار کو کراچی میں ہولناک بارشوں سے ہلاک ہونے والے افراد کی تعداد ساڑھے تین سو تک پہنچ چکی تھی۔ کاروبار زندگی معطل تھا۔ چند روز پہلے تک جو فوجی جوان اپنے جرنیلوں کے حکم پر عوام پر گولیاں برس رہے تھے، وہی گشتیوں اور دوسرے سازد سامان کے ذریعے عوام کو محفوظ مقامات تک پہنچانے اور ان کی بھرپور مدد کرنے میں مصروف تھے جس پر لوگ انہیں ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں دے رہے تھے۔

ادھر اسلام آباد میں ملک و قوم کی قسمت کے فیصلے کرنے والے ذہن برقیاری کی زد میں تھے اور یوں لگتا تھا جیسے سب کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں منجمد ہو کر رہ گئی ہوں۔ بعد دوپہر مفتی محمود نے وزیر اعظم بھٹو کو فون کیا اور کہا کہ وہ اعلیٰ سطحی اجلاس کے لئے اپنے معاونین کے ہمراہ ان سے ملنے آ رہے ہیں چنانچہ وہ بھی اپنے معاونین کو بلا لیں۔ مسٹر بھٹو نے انہیں رات کے کھانے کے بعد آنے کے لئے کہا۔ تقریباً دس بجے رات مسٹر بھٹو کے ہمراہ میں اور حفیظ پیر زادہ ایک بار پھر مفتی محمود، نواب زادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور احمد کے سامنے بیٹھے تھے۔ مفتی محمود نے بات شروع کی اور بتایا کہ جس شکل میں مسودہ ڈرافٹ کیا گیا تھا، این۔ این۔ اے کی مرکزی کونسل نے اس شکل میں اس کی منظوری نہیں دی۔ مفتی محمود خاصے افسردہ نظر آتے تھے۔

اس موقع پر پروفیسر غفور احمد نے مداخلت کی اور اظہارِ معذرت کے بعد کہا.....
 ”ہم لوگ بڑی مشکل میں ہیں، یوں لگتا ہے جیسے ہماری صفوں میں کچھ لوگوں کا رابطہ آرمی کے جہاز کے ساتھ ہو، وہ مارشل لاء لگوانے کی دھمکی دیتے ہیں۔“

نواب زادہ نصر اللہ خان بولے.....
 ”آپ ہمارے ہاتھ مضبوط کریں۔ ہم کچھ تکنیکی نوعیت کے نکات لائے ہیں جو اضافے کا درجہ نہیں رکھتے بلکہ صرف سمجھوتے کو مستند بنانے کے لئے ان کی ضرورت ہے۔“

پروفیسر غفور پھر گویا ہوئے۔ ”ہمارے بعض ساتھی کہتے ہیں کہ عمل در آمد کونسل کی آخر آئینی حیثیت کیا ہے، یہ ایک وعدہ ہے جو وفا ہوا، نہ ہوا۔ وہ کونسل میں آپ کی چیئرمین شپ تسلیم کرنے

پر بھی ہمیں مطلع کر تے ہیں۔“

مفتی محمود کو اپنے معاونین کی جانب سے بھرپور سارا ملتا تو وہ سیدھے ہو کر بیٹھے اور بولے۔
 ”آپ یوں کریں کہ اس کے لئے آئین میں ایک عبوری شق INTERM CLAUSE کا اضافہ کر دیں جس کے تحت عمل در آمد کونسل کو آئینی تحفظ مل جائے۔“
 وزیر اعظم بھٹو نے کہا:

”آپ حضرات جو نکات لائے ہیں مجھے دے دیں۔ میں ابھی اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے آپ کو اپنے روزِ عمل سے آگاہ کر دیتا ہوں.....“
 مفتی محمود نے چند کاغذات ان کی طرف بڑھا دیے اور مسٹر بھٹو اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ میں اور حفیظ بھی کینٹ روم سے ملحقہ ان کے دفتر میں چلے گئے۔

مسٹر بھٹو نے ایک نظر ان کاغذات پر ڈالی، ہمیں بھی وہ نکات پڑھ کر سنائے اور پھر بولے.....
 ”اب تم دونوں کی کیا رائے ہے؟“

”ان نکات میں کوئی نئی بات تو ہے نہیں۔“ میں نے جواب دیا..... ”نہ ان سے معاہدے کی شقوں میں اضافہ ہو گا۔ محض تکنیکی نوعیت کے چند سوال ہیں، میرے خیال میں تو ہمیں ان کو قبول کر لینا چاہئے تاکہ آج ہی کارڈ پر دستخط ہو جائیں اور پھر کوئی ڈیڈ لاک پیدا نہ ہو سکے۔“
 وزیر اعظم نے حفیظ کی طرف دیکھا وہ بولے۔

”سراسر کی کوئی ضرورت نہیں۔ انہیں جھکنے دیجئے۔ یہ بکواس کرتے ہیں کہ ان کے ساتھیوں کے جرنیلوں سے رابطے ہیں..... کوئی رابطہ نہیں..... جرنیل آپ کے ساتھ ہیں۔ دراصل ان کے اپنے غبارے سے ہوا نکل چکی ہے، اس لئے یہ ایسی باتیں کر رہے ہیں، انہیں کرنے دیں۔“
 میں نے دوبارہ سمجھوتے پر اسی روز دستخط کی ضرورت پر زور دیا تو وزیر اعظم بھٹو بولے.....

”یار گھبراتے کیوں ہو۔ یہ باتیں ہم مان لیں گے، لیکن اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ اگر ہم فوری طور پر مان گئے تو یہ لوگ سمجھیں گے، ہم کمزور پڑ گئے ہیں۔ انہیں تھوڑا سا انتظار کرانا چاہئے۔“
 ان کا فیصلہ سن کر مجھے یکفایت کرے کا درجہ حرارت نقطہ انجماد سے گرتا ہوا محسوس ہوا۔ میں خاموش ہو گیا۔ وزیر اعظم واپس کینٹ روم میں آئے اور اپنی نشست پر بیٹھنے ہی مفتی محمود سے بولے:

”ہمیں مزید مشورے کی ضرورت ہے، اس کے بعد ہی کوئی جواب دے سکیں گے۔“
 ان کی بات سن کر مفتی محمود، نواب زادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئے۔ تینوں خاموشی سے اٹھے اور اتنا ہی مایوسی کے عالم میں ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔

یہ قومی اتحاد کی مذاکراتی ٹیم سے ہماری آخری میننگ تھی جس کے بعد تقریباً نصف شب کے وقت پی۔ ایم ہاؤس کے آڈیٹوریئم میں وزیر اعظم بھٹو نے صحافیوں کو خود بریفنگ دی..... ان کا کہنا تھا۔

”طے شدہ سمجھوتے میں اب کوئی تبدیلی نہیں ہوگی، اتحاد نے نئے سرے سے مسائل کھڑے کر کے قوم کو مشکل میں ڈال دیا ہے میں معاملات کو طے کرنے کے لئے ایک حد تک ہی جا سکتا ہوں۔ اتحاد کی مذاکراتی ٹیم نے سمجھوتہ تسلیم کر لیا تھا۔ اب میں وفاقی کابینہ کے بعد ہی اتحاد کو جواب دوں گا۔“

رات کے تقریباً ساڑھے ۱۲ بجے میں جب پی۔ ایم ہاؤس سے گھر واپس پہنچا تو مجھے بخار کی سی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ گھر پہنچتے ہی گوجر خان سے رکن قومی اسمبلی راجہ عبدالعزیز بھٹی کا فون موصول ہوا۔ وہ جانتا چاہتے تھے کہ مذاکرات کا ڈول اب کہاں ڈول رہا ہے۔

میں نے انہیں مختصر جواب دیا۔

”آج کی رات بچیں گے تو سحر دیکھیں گے۔“

عزیز بھٹی کے مزید استفسار پر میں نے انہیں بتایا کہ ”صورت حال غیر تسلی بخش ہے اور کسی بھی وقت ٹیک اوور کر سکتے ہیں۔“

اسی رات ایک بے امریکی سفیر آرتھر ڈیلو بیسل نے وزیر اعظم بھٹو سے دوبارہ ملاقات کی تھی، جو ہمارے آنے کے بعد ہوئی۔ یہ ایک سرستہ راز ہے کہ اس ملاقات میں امریکی سفیر نے مسٹر بھٹو سے کیا کہا تھا۔ تاہم سننے میں آیا تھا کہ امریکی سفیر نے ”ٹیک اوور“ کے امکانات ظاہر کئے تھے جس پر مسٹر بھٹو نے اس بات کو بھی امریکہ کی تاؤ دھمکی سمجھتے ہوئے مسترد کر دیا تھا اگرچہ ڈول میں انہیں بھی اس کا یقین ہو چلا تھا۔

۴ جولائی کی شام کابینہ کا اجلاس تھا جس میں اتحاد کے پیش کردہ نکات زیر بحث آئے میں نے اس اجلاس میں بھی سمجھوتے پر فوری دستخطوں کے حق میں دلائل دیئے۔ جنرل ضیاء الحق بھی اجلاس میں موجود تھے، بھٹو سنجیدہ تھے۔ اجلاس ختم ہوا تو ہم دو چار لوگ کینٹ روم کے باہر کھڑے ہو کر گفتگو کرنے لگے۔ مسٹر بھٹو اپنے کمرے میں جا چکے تھے اور جنرل ضیاء الحق ان کے ہمراہ تھے۔ وہ تقریباً دس منٹ تک مسٹر بھٹو کے ساتھ رہے میرا خیال ہے مسٹر بھٹو اپنے کمرے میں جنرل صاحب سے امریکی سفیر کی اطلاع کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔ جنرل ضیاء الحق کمرے سے باہر نکلے تو ان کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا اور وہ بے حد جھٹ میں نظر آتے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ کسی سے ہاتھ ملاتے وقت ایک ہاتھ سے متقابل فریق کا ہاتھ کلائی سے پکڑ کر بڑی گرجوشی سے مصافحہ کرتے تھے اور کلائی دیر ہاتھ تھامے رکھتے تھے۔ اس رات یوں لگا جیسے وہ..... ہاتھ ملانہ رہے ہوں..... ہاتھ پھرا رہے ہوں۔ صرف چند انگلیاں ہاتھ سے مس کر کے..... یہ جا..... وہ جا میں سخت متعجب ہوا مگر سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کلا ہے۔

میں اور میرا افضل خان اپنے گھر جانے کے لئے روانہ ہوئے تو غلام مصطفیٰ جتوئی پی۔ ایم ہاؤس ہی میں تھے۔ طبیعت بوجھل ہونے کے سبب میں نے آپریٹر کو بتایا کہ اگر کوئی بست ہی ضروری کال ہو تو مجھے جگا یا جائے ورنہ بتا دیا جائے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں اور میں سو رہا ہوں۔ تقریباً نو بجے رات وزیر اعظم کے اے۔ ڈی۔ سی کا فون آیا جس پر آپریٹر نے بتا دیا کہ میں طبیعت خراب ہونے کے باعث سو گیا ہوں۔ اگر ناگزیر ہو تو مجھے جگا دیا جائے۔ اے۔ ڈی سی نے وزیر اعظم کو بتا دیا تو انہوں نے کہا کہ اگر وہ سو گیا ہے تو اسے نہ جگا یا جائے۔

نوبچ کر میں منٹ پر غلام مصطفیٰ جتوئی سندھ ہاؤس میں سونے کی تیاری کر رہے تھے تو وزیر اعظم کا فون انہیں بھی پہنچا خاصے خوش گوار موڈ میں انہوں نے پوچھا.....

”کیا پروگرام ہے؟“

جتوئی نے جواب دیا..... ”کچھ نہیں سر۔“

وزیر اعظم نے کہا..... ”تو پھر یہاں آ جاؤ۔“

دس منٹ کے بعد جتوئی پی۔ ایم ہاؤس میں تھے اے ڈی۔ سی نے انہیں بتایا کہ وزیر اعظم ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرنے والے ہیں۔ پی۔ ایم ہاؤس میں صحافی اور فونو گرافرز موجود تھے۔ بھٹو لان میں تھے ان کے ساتھ حفیظ پیرزادہ بیٹھے تھے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی بھی ان کے پاس جا بیٹھے۔

مسٹر بھٹو نے اے۔ ڈی۔ سی سے کھر کو ملانے کے لئے کہا لیکن باوجود تلاش کے ملک غلام مصطفیٰ کھر انہیں نہ مل سکے۔ دس بج کر پندرہ منٹ پر ممتاز بھٹو بھی پی۔ ایم ہاؤس پہنچ گئے۔ تب وزیر اعظم نے حفیظ جتوئی اور ممتاز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا.....

”آج میں معاہدے پر دستخط کر کے اس کھیل کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔“

”لیکن مر!“..... حفیظ حیرت زدہ ہو کر بولے ”ابھی کل تو ہم نے طے کیا تھا کہ جلدی نہیں کریں گے۔“

”حفیظ شٹ اپ“..... بھٹو نے نہایت سنگین لہجے میں کہا.....

”یہ کافی ہے، میں اسے ختم کرنا چاہتا ہوں“

”ENOUGH IS ENOUGH I WANT TO FINISH IT“

”SIR WHAT WILL HAPPEN THEN?“..... حفیظ نے پھر کہا.....

THESE PEOPLE ARE UNRELIABLE THEY MIGHT RAISE ANOTHER ISSUE
WE HAVE TAKEN THE WINDS OUT OF THEIR SAILS THEIR AGITATION
HAS PETERED OUT PEOPLE ARE SICK AND TIRED OF THEM THEY CAN
NOT RE-START BEFORE THREE OR FOUR MONTHS IF THEY COME OUT
AGAIN. THERE IS THE POSSIBILITY OF MARTIAL LAW BUT WE WILL
HAVE ENOUGH TIME TO LEVEL SCORE WITH THEM

”سر پھر کیا ہو گا؟ یہ لوگ ناقابل اعتبار ہیں۔ یہ کوئی اور مسئلہ کھڑا کر سکتے ہیں۔ ہم نے ان کے غباروں سے ہوا نکال دی ہے۔ ان کی تحریک (ایجی نیشن) ختم ہو چکی ہے۔ عوام ان سے تنگ آچکے ہیں۔ یہ تین چار ماہ سے قبل دوبارہ تحریک شروع نہیں کر سکتے۔ اگر یہ دوبارہ باہر آتے ہیں تو مارشل لاء لگنے کا بھی امکان ہے، لیکن ان کے ساتھ حساب برابر کرنے کے لئے ہمارے پاس کافی دقت ہو گا۔“

معاهدہ پر دستخطوں سے مسٹر بھٹو کو باز رکھنے کے لئے حفظ کے دلائل کا یہ انداز میں نے خود ان کے الفاظ میں رقم کیا ہے۔ یہ تو حفظ پر زادہ ہی بتا سکتے ہیں کہ معاهدے پر دستخطوں سے مسٹر بھٹو کو روکنے کے لئے پر زور بیان وہ کیوں دکھا رہے تھے۔ میری عدم موجودگی میں اس رات ہونے والی اس گفتگو کے راوی جناب غلام مصطفیٰ جتوئی ہیں، جنہوں نے حفظ کے وہ کبھی نہ بھولنے والے مکالمے ان کے اصل لفظوں میں یاد رکھے تھے۔ مسٹر بھٹو نے حفظ کی ”تقریر و پینڈیر“ کے بعد جتوئی سے ان کی رائے پوچھی تو انہوں نے حفظ سے اختلاف کرتے ہوئے کہا ”اگر مذاکرات میں تعطل آیا تو پی۔ این۔ اے والے دوبارہ اپنی صفوں کو منظم کر کے عوام کو سڑکوں پر لے آئیں گے۔“ حفظ تو کہتے ہیں کہ مارشل لاء تین چار ماہ میں آئے گا لیکن میرا خیال ہے یہ تین چار ہفتے بھی نہیں لے گا۔“

وزیر اعظم نے آخر میں ممتاز کی رائے دریافت کی تو انہوں نے بھی جتوئی کے خیالات سے اتفاق کیا، جس کے بعد مسٹر بھٹو نے فیصلہ کن انداز میں کہا..... ”میں پی۔ این۔ اے کے ساتھ سمجھوتے پر کل دستخط کر دوں گا آج رات کی پریس کانفرنس میں اسی کا اعلان کر رہا ہوں۔“

رات ساڑھے گیارہ بجے پریس کانفرنس شروع ہوئی اور تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہی جس میں مسٹر بھٹو نے اعلان کیا کہ وہ سمجھوتے پر دستخط کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور کل صبح یہ سمجھوتہ ہو جائے گا۔ انہوں نے صحافیوں کو بتایا ”اتحاد کی مذاکراتی ٹیم مزید دوں نکات لے کر آئی تھی اور ان لیڈروں نے خود اس پر شرمندگی ظاہر کی کہ وہ نئے سرے سے مسائل کو چھیڑنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن اب مجبور ہو گئے ہیں۔ بہر حال وہ مجبور ہوں گے..... میں نہیں ہوں۔ چنانچہ کل میں سمجھوتے پر دستخط کر دوں گا۔“

جتوئی ”ممتاز اور پیر زادہ رات کے تقریباً نو بجے پی۔ ایم۔ ہاؤس سے روانہ ہوئے تھے اور اس وقت تک انہوں نے سڑکوں پر کسی بھی جگہ ٹینک یا فنی دستے نہیں دیکھے تھے۔ آرمی کے دستوں نے ٹھیک دو بج کر تیس منٹ پر حرکت کی شاید جرنیلوں کو پی۔ ایم ہاؤس سے غیر متعلقہ افراد کے جانے کا انتظار تھا۔ بھٹو اس وقت جاگ رہے تھے جب انہیں رات اڑھائی بجے ممتاز بھٹو کا فون آیا کہ انہوں نے سڑکوں پر آرمی کے دستے نکلتے دیکھے ہیں پھر کچھ ہی دیر بعد نورانے اس بات کا نوٹس لیا کہ پی۔ ایم ہاؤس میں ڈیوٹی پر متعین پولیس گارڈز لپٹا کٹ غائب ہو گئے ہیں اس نے فوراً بھٹو صاحب کو جا کر صورت حال بتائی انہوں نے فون اٹھا کر آپریٹر سے کہا۔

”میر جزل امتیاز سے بات کراؤ۔“

اس وقت تک فون کا رابطہ برقرار تھا آپریٹر نے کچھ دیر بعد وزیر اعظم کو آگاہ کیا۔

”جزل امتیاز کے گھر سے جواب ملا ہے کہ وہ جی۔ ایچ۔ کیو جا چکے ہیں۔“

مسٹر بھٹو نے پھر حکم دیا

”جزل ضیاء الحق سے بات کراؤ۔“

آرمی ہاؤس سے بھی یہی جواب ملا کہ جزل ضیاء الحق جی۔ ایچ۔ کیو میں ہیں۔

مسٹر بھٹو سمجھ گئے کہ کیا ہونے والا ہے۔ انہوں نے آپریٹر سے کہا:

”جی۔ ایچ۔ کیو میں جزل ضیاء الحق سے بات کراؤ۔“

کافی تاخیر سے جزل ضیاء الحق لائن پر آئے تو مسٹر بھٹو نے کہا:

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے سنا ہے کہ آرمی حرکت میں آچکی ہے۔ کیا یہ درست ہے؟“

جزل ضیاء الحق نے بڑے غھرے ہوئے لہجے میں جواب دیا:

”آپ نے درست سنا ہے سر! مجھے افسوس ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔“

تھوڑی دیر تک صورت حال واضح کرنے کے بعد جزل ضیاء الحق نے مسٹر بھٹو سے دریافت کیا۔

”سر آپ کہاں جانا پسند کریں گے؟ مری لاؤ کاندہ یا کراچی؟“

بھٹو نے جواب دیا

”مری“ پھر انہوں نے اپنے بیوی بچوں کے بارے میں دریافت کیا تو جزل ضیاء الحق نے جواب

دیا۔

”بیگم صاحبہ آپ کے ساتھ جا سکتی ہیں، لیکن بچے لاؤ کاندہ جائیں گے۔“

مسٹر بھٹو نے کہا.....

”بیگم صاحبہ بچوں کے ساتھ لاؤ کاندہ جانا چاہتی ہیں“

جزل ضیاء الحق نے جواب دیا.....

”ٹھیک ہے سر! صبح ناشتے کے بعد آپ کو مری پہنچا دیا جائے گا۔“

اس کے بعد رابطہ ختم ہو گیا۔ اس رات آخری فون جو مسٹر بھٹو نے سنا وہ ملک غلام مصطفیٰ کھر کا

تھا، جنہیں وہ رات گئے تک تلاش کراتے رہے تھے۔ کھر کا فون جزل ضیاء الحق سے مسٹر بھٹو کی گفتگو کے

فوراً بعد آیا۔ شاید کھر کو اپنے ذرائع سے نیک اور کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ شہر میں کسی نامعلوم مقام سے

بول رہے تھے۔ انہوں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا.....

”سر! میں نے سنا ہے کہ.....“

اور پھر..... فلیپ فون کی لائن کٹ گئی!

جرنیلوں کی رات کا آغاز ہو چکا تھا!!